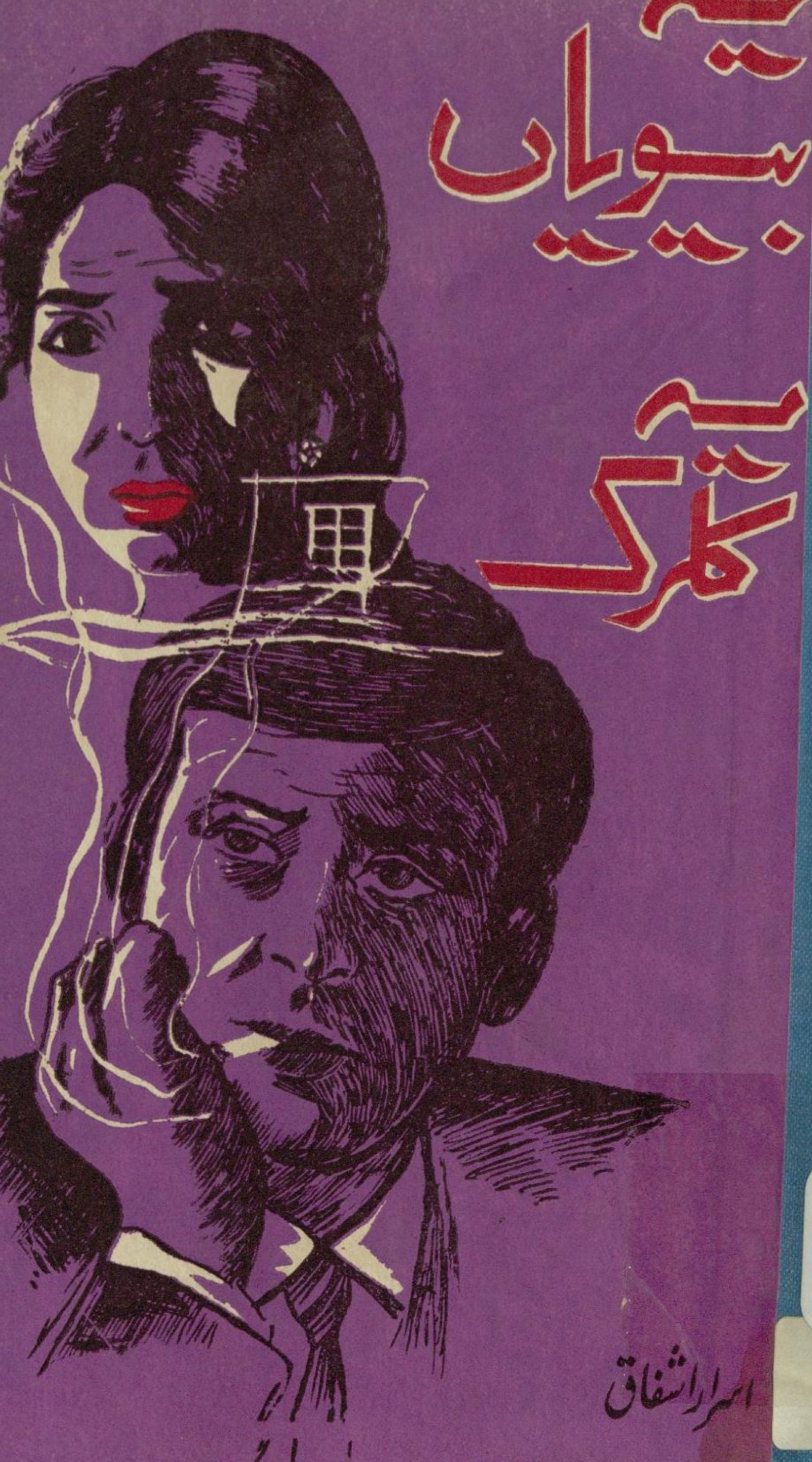

بیویاں
اسرار اشفاق

یہ بیویاں
یہ کلرک

اسرار اشفاق

طابع — شیخ نیاز احمد
مطبع — علی پرنٹنگ پریس لاہور
اشاعت دوم — ۱۹۶۸ء
قیمت — [redacted]

ناشرین
شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز۔ ادبی مارکیٹ۔ چوک انارکلی۔ لاہور

فہرست

انتساب

اپنی بیوی شمس النساء بیگم کے نام جس نے مجھے
عمر قید کی بامشقت مرغوب سزا دی۔

بات دراصل یہ ہے کہ تلخ اندیش کو اپنے زمانے کا سب سے بڑا بت شکن ہونے کے باعث ہر قسم کے جذباتی ردِّ عمل سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے اور شاید اسی لئے وہ ظریفانہ طرزِ تحریر کو سپر بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ ایک تو وہ جذباتی ردِّ عمل سے محفوظ ہو جاتا ہے اور دوسرے اس کے وار میں بلا کی شدّت پیدا ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا

حرفِ مُدعا

اردو طنز و مزاح پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اور آئندہ بھی لکھا جائیگا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ صفِ اول کے طنز نگار ہمارے درمیان سے اٹھتے جاتے ہیں اور ان کی جگہ لینے کے لئے کوئی دوسری شخصیت موزوں اور مناسب نظر نہیں آتی۔ لے دے کے پاک و ہند کے اردو طنز نگاروں میں رشید احمد صدیقی۔ کنھیا لعل کپور، ابراہیم جلیس اور اسرار اشفاق کی ذوات والا صفات رہ گئی ہیں جن پر اردو زبان کو بجا طور پر فخر حاصل ہے

پاکستان میں شوکت تھانوی مرحوم کے انتقال کے بعد ادبی فضا پر ایک جمود کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی خصوصیت سے طنز و مزاح کے نشتر اور مطائبات کی سوئیاں یکدم مفقود ہوگئیں۔ لیکن خدا بھلا کرے اسرار اشفاق کا۔ کہ انہوں نے اس خلا کو اس خوبی سے پر کیا ہے۔ کہ اب شوکت تھانوی مرحوم کو قبر میں ہر ہر کروٹ چین نصیب ہے اپنے مرنے سے قبل انہوں نے اس امر کا اشارہ اپنے ایک خط میں کیا تھا۔ جو اسوقت "یہ بیویاں یہ کلرک" کے مقدمے میں شامل ہے۔

"یہ بیویاں یہ کلرک" اسرار اشفاق کے طنزیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ جسے انجمن اردو مصنفین نے بڑے اہتمام سے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا تھا۔ سوسائٹی کے جس طبقے کی ان مضامین میں نمائندگی کی گئی تھی۔ اس کا تقاضا تھا کہ یہ کتاب شرف قبولیت حاصل کرتی چنانچہ یہی ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں اس کتاب کی تمام کاپیاں ختم ہوگئیں۔ اور اب خود اسرار اشفاق لاہور کے ایک ممتاز ناشر سے اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن نکلوا رہے ہیں۔ اس گرانی اور ادبی عدم وابستگی کے دور میں کسی کتاب

کا دوسرا ایڈیشن نکالنا اس بات کی صریحاً دلیل ہے۔ کہ وہ کتاب عوام میں کافی حد تک مقبول ہو چکی ہے۔

میں اس کتاب کی دوبارہ اشاعت پر اسرار اشفاق کو مبارکباد دیتے ہوئے ان سے توقع رکھوں گا۔ کہ وہ اس اعلیٰ فن کو مسلسل اور متواتر نکھارنے کی کوششیں جاری رکھیں گے۔ میری طرح اور بھی حضرات ان کی جودت طبع اور پرکشش طنازی کے قائل ہیں۔

میں عوام سے بھی اپیل کروں گا کہ وہ اس کتاب کے حسن وقبح سے ناشر یا مصنف کو باخبر کریں۔ تاکہ آئندہ مصنف موصوف اس سے بہتر تصنیف پیش کر سکیں

محسن مرزا برلاس

۶۵/۲/۶

صدر انجمن اردو مصنفین پاکستان لاہور

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے

اصلی یعنی رجسٹرڈ نام اسرار الحق اور اشتہاری یعنی اخباری نام اسرار اشفاق ہے ۔ مصیبت گاہ عالم میں وارد ہونے کی اصل تاریخ ۱۸ مئی ۱۹۱۹ء ہے ۔ اور اس تاریخ کی تصدیق بدقسمتی سے میٹرک کے سرٹیفکیٹ سے بھی ہوتی ہے ۔ ۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ سے بی ۔ اے پاس کیا ۔ اور جنوری ۱۹۴۱ء میں ہر ہٹلر کی سفارش سے جنرل ہیڈ کوارٹرز انڈیا میں ملازم ہوا ۔

تقسیم ہند کے وقت کہ اپنے کا دولت خانہ ، شملہ میں تھا ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد تاریخ شہادت مقرر ہونے ہوتے کسی نامعلوم وجہ سے ملتوی ہوگئی ۔ تقسیم کے بعد دولت ہند میں چھوڑ آیا اور یہاں آکر بے چارے کا ایسا خانہ خراب ہوا کہ آج تک "خانے" کی تلاش میں ہے ۔

اس دنیا سے رخصت ہونے کی تاریخ ضبط تحریر میں آچکی ہے ۔ مگر اس کا اعلان نہیں ہوا ۔

آج کل جی ۔ ایچ ۔ کیو پاکستان میں بحیثیت سپرنٹنڈنٹ اور ۵۱۴ ایچ کالج روڈ میں بحیثیت شوہر قیدِ حیات بھگت رہا ہے ۔ اللہ ہی جانتا ہے ۔ کب تک اور یونہی بھگتے گا ۔

"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد ہے"

"...... نہ ہم ہارے"

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن انجمن اردو مصنفین پاکستان لاہور نے بڑی محنت کے بعد ۱۹۶۳ء میں نکالا تھا۔ یہ سب برادر محترم محسن مرزا برلاس کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ کتاب ہر طرح سے ٹھیک شائع ہوئی۔ مگر پروف نہ پڑھا جانے کی وجہ سے ایک خامی رہ گئی وہ یہ کہ کاتب نے دو سو صفحوں میں کتابت کی دو سو غلطیاں کیں۔ خوشی اس بات کی ہے کہ کاتب نے انصاف کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ جتنے صفحے اتنی ہی غلطیاں کیں۔ اتنا سکور حنیف محمد نے کبھی کرکٹ میں بھی نہیں کیا۔ کاش یہ کاتب کتابت کے میدان میں جوہر دکھانے کی بجائے کرکٹ کے میدان میں اپنے جوہر دکھاتا۔ لیکن مجھے اس بات کا اطمینان ہے۔ کہ میں نے صرف دو سو صفحے لکھے اگر خدانخواستہ پانچ سو صفحے لکھنے کی غلطی کرتا تو یقیناً کتابت کی غلطیاں بھی پانچ سو ہوتیں۔ کاتب کو اور زحمت کرنی پڑتی۔ جہاں پر کاتب سے غلطی سے کتابت کی غلطی نہ ہو سکی۔ وہاں اس نے ایک دو سطریں غائب کر کے فراخدلی کا ثبوت دیا۔ اللہ تعالےٰ اسے قرار واقعی جزا دے۔

میں نے انجمن کے سیکریٹری صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ کوشش کر کے اس ایڈیشن کو دسویں جماعت کے نصاب میں شامل کرالیں۔ امتحان کے پرچوں میں ایک سوال پیرا درست کرنے کا ہوتا ہے۔ وہ پیرا اس ایڈیشن میں سے دیا جائے۔ ممتحن کو کوئی ضرورت نہیں کہ وہ خود تکلیف کر کے ایک پیرا کو غلط بنائے۔ اس ایڈیشن میں بنا بنایا غلط پیرا مل جائے گا۔ سیکریٹری صاحب کو شاید میرا مشورہ پسند نہیں آیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے

کہ انہوں نے کوشش کی ہو اور کامیاب نہ ہوئے ہوں۔ کیونکہ ایسی بے شمار کتابیں ہیں۔ جن میں بے شمار کتابت کی غلطیاں ہیں۔ اور اب یونیورسٹی والے اس کتاب کو نصاب میں شامل کر کے دوسری کتابوں کی حق تلفی کیوں کرتے۔

میرے احباب نے اس کتاب کو پڑھ کر مجھے قیمتی مشورے بھی دیئے۔ ان قیمتی مشوروں کی قیمت ادا کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ اکثر احباب نے مجھ کو یہ قیمتی مشورہ دیا کہ اگر فلاں مضمون کتاب میں سے نکال دیا جاتا تو کتاب بہترین ہوتی میں نے ایسے تمام مضامین کی فہرست بنائی تو مجھے روحانی خوشی حاصل ہوئی۔ کیونکہ کتاب کے ٹائیٹل میرے تعارف شوکت تھانوی اور زبیدہ خاتون کے پیشِ لفظ کے سوا کتاب میں کچھ باقی نہ بچا۔ یہ احساس ضرور ہوا کہ خواہ مخواہ مضامین لکھنے کی جھک ماری۔ اس کے برعکس اکثر احباب نے اپنے پسندیدہ مضمون کی بے حد تعریف کی۔ جب ان مضامین کی فہرست بنائی تو کتاب کے ٹائیٹل۔ میرے تعارف شوکت تھانوی اور زبیدہ خاتون کے پیشِ لفظ کے سوا سب مضامین کتاب میں شامل تھے۔ یعنی حساب برابر رہا۔ نہ وہ جیتے نہ ہم ہارے۔

میں اپنے دوست احباب اور دیگر کرم فرماؤں جنہوں نے مضامین کو پسند کیا اور میری حوصلہ افزائی کی۔ ان سب کا شکر گزار ہوں اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔

اسرار اشفاق
فروری ۱۹۶۵ء

پیش لفظ

اُردو ادب کی بزمِ مزاح میں ایک نئے مزاح نگار کا خیر مقدم کرنے کا شرف مجھ کو حاصل ہو رہا ہے اور میں اس دعا کے ساتھ جناب اسرار اشفاق کو خوش آمدید کہہ رہا ہوں کہ خدا کرے یہ وادی اُن کے لیے سازگار ثابت ہو اور وہ اس راہ سے گزرتے ہوئے اپنی منزل سے بھٹکنے نہ پائیں۔

ابھی چند دن ہوئے کہ رسالہ نقوش نے اس سوال پر اپنا ایک سمپوزیم منعقد کیا تھا کہ ادب اُردو کی مختلف اصناف تنزل پذیر ہیں یا نہیں اور ان اصناف ادب میں سے مجھ سے مزاجیہ ادب کے متعلق سوال کیا گیا تھا تو میں نے یہی جواب دیا تھا کہ ہمارے مزاجیہ ادب کا توازن کچھ بگڑ کر رہ گیا ہے اِس لیے کہ جس ذوق و شوق سے مزاح نگار مر رہے ہیں اس رفتار سے نئے مزاح نگار پیدا نہیں ہو رہے ہیں اور یہ بات یقیناً تشویش انگیز ہے کہ اپنی جگہ خالی کرنے والوں کو اگر جانشین نہ ملے تو اُردو ادب کے مزاح کا مستقبل کیا ہوگا۔ یہ جواب دے چکنے کے بعد مجھ کو جناب اسرار اشفاق کے مزاجیہ مضامین کے چند مسودات محبِ مکرم میجر منان اللہ بیگ نے اس مقصد سے دکھائے کہ میں ان پر مقدمہ کی شکل میں کچھ لکھ دوں تاکہ جناب اسرار اشفاق کا یہ مجموعہ کتابی صورت میں پیش کیا جا سکے۔ میں نے ان مضامین کو شروع سے آخر تک پڑھا اور مجھ کو اعتراف کرنا چاہیے کہ جا بجا مجھ کو چونکنا پڑا بلکہ اگر یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ہر اُس جگہ چونکنا پڑا جہاں جناب اسرار اشفاق نے دانستہ مزاح پیدا کرنے کی

کوشش نہیں کی ہے بلکہ ان کی غیر ارادی بے ساختگی مزاح بن گئی ہے یعنی جہاں اُنھوں نے اپنے قاری کو زبردستی ہنسانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ وہ خود بخود مسکرا دیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ یہی ارادہ ان کے مستقبل کے مضامین میں کم سے کم اور یہی بے ساختگی اُن کی آئندہ قلم فرسائیوں میں زیادہ سے زیادہ پیدا ہو جائے ان میں میری اس خواہش کی بھرپور صلاحیتیں موجود ہیں جو جگہ جگہ اپنی جھلک دکھا رہی ہیں۔ مگر ابھی ان کے مضامین کے قاری کو یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مزاح نگار گدگدا رہا ہے جس دن یہ ارادہ وہ ترک کر دیں گے اور اُن کی تحریر میں وہ بھول پن پیدا ہو جائیگا جو بغیر کسی ارادے کے ہنسا سکے اس دن ان کا آرٹ اپنی اس تکمیل کو پہنچ جائے گا جس کی اس صنفِ ادب کو ضرورت اور پیاس ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ منزل ان کے لیے دور نہیں ہے، مذاق اور بد مذاقی کے فرق کو وہ خود سمجھتے ہیں اور یہی امتیاز میری اس توقع کو تقویت پہنچا رہا ہے کہ وہ مزاح لطیف کی روح تک پہنچنے کی راہ نکال کر رہیں گے۔ ان شاء اللہ

شوکت تھانوی

"یہ بیویاں"

(اپنی بیوی اور ان دوستوں کی بیویوں سے معذرت کے ساتھ
جو اتفاقاً مجھے جانتی ہیں)۔

کسی انگریز نے کیا خوب کہا ہے کہ شادی ایک جال ہے جو اس سے باہر ہیں وہ اس میں پھنسنا چاہتے ہیں اور جو اس میں پھنسے ہوئے ہیں وہ باہر نکلنا چاہتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ ایک کنوارا جوان مال روڈ پر شادی شدہ جوڑے کو بڑی حسرت سے دیکھتا ہے کہ وہ دن جلد آئے کہ وہ بھی اسی طرح سیر کرے لیکن جب وہی نوجوان شادی کے بعد کسی کنوارے کو آزاد گھومتا پھرتا دیکھتا ہے تو اُسے بھی بڑی حسرت سے دیکھتا ہے کہ اب ایسا وقت کہاں آئے گا۔

شادی کے بعد تھوڑا سا عرصہ تو خوشگوار گزر جاتا ہے۔ شاید بیوی صاحبہ شادی سے پہلے والدین کے گھر خاوند کے لیے کام کاج سیکھتے سیکھتے تھک جاتی ہیں اس لیے شادی کے فوراً بعد خاوند کے زیرِ سایہ چند ماہ آرام فرماتی ہیں اور یہی عرصہ ذرا اچھا گزرتا ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ گھر کا کام سنبھالنا شروع کر دیتی ہیں۔ اور حالات بھی آہستہ آہستہ تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ جب وہ مکمل طور پر گھر کا کام کاج سنبھال لیتی ہیں تو حالات بالکل ہی بدل جاتے ہیں۔ گھر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بی ڈویژن کا تھانہ ہو اور بیگم صاحبہ سب انسپکٹر انچارج تھانہ اور خود میاں ایسے ملزم جن کا نام بستہ الف میں درج ہو۔ میاں پر اُٹھتے بیٹھتے روک ٹوک اور جرح

ہوتے لگتی ہے اور جرح ایسی شاندار کہ سرکاری وکیل بھی حیران رہ جائے۔

میرے ایک دوست اتفاقاً سرکاری وکیل ہیں اور فرماتے ہیں کہ ان کی جرح سے لوگ گھبراتے ہیں، مگر اپنی بیوی کی جرح سے وہ خود گھبراتے ہیں۔ ایک دن آپ نے پسندوں کی فرمائش کی۔ بیگم صاحبہ کا خود پکانے کا ارادہ نہیں تھا۔ اس لیے ارشاد ہوا "تو یہ تو یہ آپ گوشت کھائیں گے۔ صبح بھی گوشت تھا اب پھر گوشت۔ ابھی کل ہی تو ڈاکٹر مظفر کہہ رہے تھے کہ گوشت سے بلڈ پریشر ہوتا ہے کم کھانا چاہیے۔ آپ کو آئے دن پسندوں کا شوق چرایا رہتا ہے"۔ لیجیے، مقدمہ خارج اور اپیل کی بھی گنجائش نہیں۔

ایک اتوار ارادہ کیا کہ ذرا دو ایک دوستوں کو مل آئیں۔ ابھی کپڑے تبدیل ہی کیے تھے کہ جرح شروع ہو گئی۔

"اتوار کو بھی گھر میں قدم نہیں ٹکتے۔ کہاں کے ارادے ہیں"؟

عرض کیا "ایک دوست سے ملنا ہے"۔

"کون ہیں یہ دوست۔ مجھے بھی تو معلوم ہو"، سوال ہوا۔

"ایک صاحب ہیں"۔ دوست کا نام گول کرتے ہوئے عرض کیا۔

پھر پوچھا گیا "اچھا تو آج ہی ملنا ضروری ہے"؟

جواب دیا "ہاں ہے تو کچھ ضروری"۔

فرمایا "کبھی آپ کا دل یہ نہیں چاہتا کہ چھٹی کا دن ہے گھڑی دو گھڑی بچوں سے دل بہلائیں۔ صبح دفتر گئے۔ شام گھر آئے۔ پھر کلب چلے گئے۔ یہ ہے روز کا چکر۔ اتوار کو بھی گھر بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ اچھا دوپہر کے کھانے کے وقت سے پہلے ہی آ جائیے گا"۔

کلب میں اکثر رات کو دیر ہو جاتی ہے۔ ہر روز کلب سے چلتے وقت ارادہ

کیا جاتا ہے کہ کل ضرور وقت پر گھر پہنچیں گے۔ بیوی سے وعدہ بھی کیا جاتا ہے کہ کل دیر نہ ہوگی۔ یہ کل کبھی نہیں آتی۔ جس دن بہت جلد گھر آنے کا ارادہ کیا جاتا ہے اُسی دن زیادہ دیر ہو جاتی ہے۔ دوستوں سے دل چسپ گفتگو ہو رہی ہے۔ برج یا پھر شطرنج جمی ہے۔ بس اُٹھتے اُٹھتے گیارہ ساڑھے گیارہ بج گئے۔ ادھر میاں نے آہستہ سے گھر میں قدم رکھا، اُدھر بیگم صاحبہ نے ماتھے پر بل ڈال کر دیکھا، اور فرمایا "فرصت مل گئی گھر آنے کی۔ میں تو ہر روز کہتے کہتے تنگ آ گئی کہ وقت پر آئیے۔ وقت پر آئیے۔ مگر میری کون سنتا ہے۔ وہاں تو ٹوگی پر نگی چلتی ہے، بس میں نے اب کہنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ اب کچھ نہ کہوں گی۔"

میاں صاحب خوش ہوئے کہ معاملہ یہیں پر ختم ہوا۔ مگر بیگم صاحبہ کا حافظہ اتنا کمزور واقعہ ہوتا ہے کہ ابھی یہ کہا کہ اب کچھ نہ کہوں گی اور ابھی ایسا کہنے لگیں کہ بند ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں۔

"کوئی ان سے پوچھے۔ یہ آدھی رات کو گھر آنے کا وقت ہے۔ شریف لوگ دو بجے رات ہی کو گھر آتے ہوں گے۔"

گھڑی دیکھ کر ڈرتے ڈرتے کہا۔ "ابھی تو صرف گیارہ ہی بجے ہیں۔"

فرمانے لگیں۔ "دو اور گیارہ میں فرق ہی کیا ہے؟ آدھی رات تو ہو ہی گئی۔ آگ لگے اس کلب کو۔ دنیا بھر کے بے فکرے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ ہاہا ہو ہو ہوتی رہتی ہے۔ کہتے ہیں ابھی گیارہ ہی بجے ہیں۔ گیارہ کون سے کم ہیں۔ پرانے تو بارہ ہی ہوئے۔ بارہ نہ سہی ساڑھے گیارہ سہی۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ خدا سمجھے اس حکومت کو۔ لوگ تو آگے کو ترقی کرتے ہیں انہوں نے وقت میں بھی پیچھے کو ہی ترقی کی۔ کیا ترقی کی ہے صرف اپنے مطلب کے لیے اور بیویوں کو دھوکا دینے کے لیے ایسا کیا ہے۔ رات کو آئیں تو بارہ بجے اور کہہ دیں ابھی تو صرف گیارہ ہی بجے

بجے ہیں۔ میں کہتی ہوں اگر اسی طرح ایک ایک گھنٹہ گھڑیاں پیچھے کرتے رہے تو کبھی دوپہر کے دو آدھی رات کو بجیں گے تو پھر آپ بھی فخر سے کہہ سکیں گے۔ بیگم یہ آدھی رات کہاں ہے ابھی تو دوپہر کے دو بجے ہیں گھڑی تو دیکھو"

کیا غضب کا استدلال ہے ایسے موقع پر جو کمبخت ماما ہوتی ہے وہ غصہ کو اور ہوا دیتی ہے۔

"صاحب ٹھنڈے کھانے میں کیا مزہ ہے اور پھر بیگم صاحبہ انتظار کرتی رہتی ہیں" اس حمایت پر بیگم صاحبہ اور چمک اٹھتی ہیں اور اگر آپ کے والدین آپ کے ساتھ ہی رہتے ہیں یا اتفاقاً آئے ہوئے ہیں تو پھر بیگم صاحبہ اُن کے کاندھے پر بندوق رکھ کر نشانہ لگاتی ہیں۔

"خیر میرے انتظار کو تو چولھے میں ڈالو۔ کم از کم بزرگوں کا تو خیال کرنا چاہیے ابا جان بہت دیر تک انتظار کرتے رہے۔ آخر تنگ آکر انھوں نے کھانا کھا لیا بزرگوں کا کچھ تو ادب لحاظ ہونا چاہیے"

اس حربہ سے کچھ نہ کچھ خفت اور ندامت ضرور ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر صرف یہی چارہ ہے کہ خاموش رہا جائے۔

کرنل یوسف کبھی دیر سے رات کو گھر پہنچتے تھے، تو گھڑی دو ایک گھنٹے پیچھے کر لیتے تھے۔ رات چار بجے گھر پہنچے، بیوی نے وقت پوچھا تو بتا دیا دو بجے ہیں۔ اور گھڑی سامنے کر دی۔ بیوی عادتاً تھوڑی دیر بول کر سو جاتی تھیں۔ ایک رات چار بجے کے بعد گھر پہنچے۔ بیوی کے پوچھنے پر دو بجے کا وقت بتا دیا بیوی نے بولنا شروع کیا۔ کرنل صاحب کپڑے تبدیل کر رہے تھے۔ کہ مسجد سے صبح کی اذان کی آواز آئی۔ کرنل صاحب کا خون خشک ہو گیا۔ بیگم گھور کر بولیں۔ "یہ رات کے دو بجے کون سی نماز کی اذان ہو رہی ہے۔ کہیں رمی یا برج کھیلنے کی

اذان تو نہیں "۔ کرنل صاحب دل میں اتنا کہہ کر ہائے کمبخت کو کس وقت خدا یاد آیا بالکل خاموش ہو رہے۔

اس لیے بہتر ہے کہ بیوی کو رات کے وقت اگر وقت بتانے کی ضرورت ہو تو اتنا ضرور دیکھ لیا جائے کہ اذان کا وقت تو نہیں۔

اگر دیر میں آنے کی تاویل میں مذہب کی آڑ لی جائے تو اور بھی گل کھلتے ہیں۔

"بیگم! آج تو میں جلد ہی آ رہا تھا۔ مگر رؤف صاحب گھر لے گئے۔ اُن کے ہاں آج محفلِ میلاد تھی بہت دور دور سے نعت خواں آئے ہوئے تھے میں تو بیچ میں ہی چھوڑ کر آگیا۔"

یا پھر بہانہ بنایا جاتا ہے "آج نصیر بھائی کے ہاں ختم قرآن شریف تھا۔ وہاں سے جلد بھاگ آنا ذرا معیوب تھا" یا پھر بہانہ تراشا جاتا ہے "آج سردار اسلم صاحب کے ہاں قوالی تھی۔ دور دور سے مشہور آرٹسٹ آئے ہوئے تھے۔ اسلم صاحب نے بٹھائے رکھا، اُٹھنے ہی نہ دیتے تھے، بڑی مشکل سے اجازت لے کر آیا ہوں" اتنا سنتے ہی بیگم صاحبہ کو جلال آجاتا ہے۔

"میں کہتی ہوں یہ روز روز کا سلسلہ کب ختم ہو گا۔ کبھی محفلِ میلاد کبھی قوالی، اور کبھی مولانا قلندر علی کی تقریر ہے۔ یہ رؤف صاحب۔ نصیر اور اسلم نیک کاموں میں حصہ لینے لگے ہیں۔ اللہ ہی خیر کرے۔ پہلے ہی دنیا میں بہت نیکیاں ہوتی ہیں احباب رہی کسر یہ پوری کر دیں گے۔ میں کہتی ہوں نصیر صاحب اللہ تو "ع" سے لکھتے ہیں اور اب ختم قرآن کر رہے ہیں۔ سر سے پاؤں تک مغربیت چھائی ہوئی ہے۔ اصل میں فلمی نعتیں ہو رہی ہوں گی اور نام دے دیا میلاد شریف کا۔"

عرض کیا: "نصیر بھائی نے "ع" سے اللہ کب لکھا تھا۔ اس لیے چار سے

نے تو علیا لکھا تھا جو اُس کے نوکر کا نام ہے مگر آپ نے جلدی میں اللہ پڑھ لیا تھا"۔

"خیر کچھ بھی ہو یہ آپ کے دوست مجھے پسند نہیں۔ بہت بے فکرے اور بے کار لوگ ہیں۔ خواہ مخواہ آپ کا وقت بھی ضائع کرتے ہیں، دل چاہتا ہے کہ ان کی بیویوں سے ملاقات کروں اور اُن سے کہوں کہ اپنے خاوندوں کو سنبھال کر کیوں نہیں رکھتیں"۔

دوستوں کا نام لے دینے سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوتا ہے کہ بیگم صاحبہ آپ کو تو معصوم سمجھ لیں گی اور آپ کے دوستوں کی شان میں قصیدہ کہہ ڈالیں گی۔ ان کے خیال میں آپ تو بالکل بے قصور ہیں اور سارا قصور آپ کے دوستوں کا ہے جو آپ کو گھر سے باہر رکھتے ہیں اور بُرے رستے پر ڈال رہے ہیں۔

اکثر باتوں میں بیگمات کا دماغ اور طبیعت بالکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پاس بیویوں کے دماغ کا صرف ایک ہی پیٹنٹ سانچہ ہے بھی ان کے دماغ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہ سوچتی ایک جیسا ہیں۔ سمجھتی ایک جیسا ہیں اور باتیں بھی ایک جیسی کرتی ہیں۔

آپ کو شاپنگ کے لیے بازار بھیجا جا رہا ہے۔ بیگم صاحبہ نے آپ کے ہاتھ میں ایک فہرست تھما دی ہے، فہرست میں تمام چیزیں درج ہیں جو آپ کو خریدنا ہیں۔ اس کے باوجود بیگم صاحبہ گھر کے دروازہ تک آپ کے ساتھ ساتھ چلی آئیں گی اور فہرست میں زبانی اضافہ ہوتا جائے گا: "یہ چیز ضرور لائیے گا لکھنے سے رہ گئی اور وہ چیز بھی لائیے گا لکھنا بھول گئی"۔ اور پھر ہدایات کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔

"دس بارہ دکانیں دیکھ کر خریدیئے گا۔ قیمت کا خیال رکھیے گا۔ بھاؤ تاؤ ضرور کیجیے گا۔ جو مانگے وہی نہ دے دیجیے گا۔ کوڑے پتلوں کی شان میں نہ آجائیے گا"۔

بیویوں کو ایک غلط فہمی تو یہ ہوتی ہے کہ مرد جب بازار جاتے ہیں تو ہمیشہ لٹ کر

آتے ہیں۔ ایک کے بجائے چار پیسے وسے آتے ہیں۔ لیکن دکاندار خود کہتے ہیں کہ صاحب ہم آپ سے کیا نفع لیں۔ اصل نفع تو عورتوں سے ہوتا ہے۔ ان کی ہر رمز ہم کو معلوم ہے۔ ان کو دو روپیہ کی چیز دو روپیہ دو آنے میں ٹکا دیتے ہیں اور وہ بہت خوش ہو جاتی ہیں کہ دکاندار کو لوٹ لیا۔

اگر آپ کو گھر میں امن امان اور سکون کی ضرورت ہے، تو یاد رکھیے بیگم صاحبہ سے سچ ذرا کم ہی بولیے۔ سچ بولنا بڑی حد تک خطرناک اور جھگڑے کا باعث ہوتا ہے۔ اگر آپ گھر میں کوئی چیز لائیں گے اور وہ چیز پیک کی ہوئی ہے بیگم صاحبہ چیز کو دیکھے بغیر پہلے تو اس کی قیمت دریافت کریں گی۔ اگر آپ غلطی سے ٹھیک قیمت بتا دیں گے تو فوراً کہہ دیں گی "بہت مہنگی ہے"۔ مزے کی بات یہ ہے کہ چیز ڈبہ میں بند ہے۔ دیکھی تک نہیں مگر قیمت کے متعلق فیصلہ دے دیا۔ ان حالات میں خود قیمت کبھی نہ بتایئے۔ فرض کیا آپ زنانہ سوٹ کا کپڑا لائے ہیں۔ پہلے بیگم صاحبہ کو کپڑا دکھا دیجیے اور پھر پوچھیے ان کے خیال میں کتنے روپے گز کا کپڑا ہوگا کیونکہ وہ کپڑے کے معاملے میں ماہر ہیں اس لیے اندازاً ہی بتا دیں۔ اب بیگم صاحبہ اپنی فضیلت قائم رکھنے کے لیے سوچ سمجھ کر آپ کو قیمت بتا دیں گی جو اصل قیمت سے بہت دور ہو گی۔ اب آپ کا فرض یہ ہے کہ اصل قیمت نہ بتائیں، بلکہ جو بیگم صاحبہ نے بتائی ہے اس سے دو آنے کم ہی بتائیں۔ بیگم صاحبہ اپنی قیمت بتانے پر ناز کریں گی۔ آپ ان کو ناز کرنے دیجیے۔ اس میں روڑے نہ اٹکایئے۔ وہ کپڑے کی تعریف بھی کریں گی۔ آپ سنتے رہیے۔ اگر خدانخواستہ آپ نے اصل قیمت بتا دی تو فوراً فتویٰ جاری ہو گا لوٹ کر آ گئے اور کپڑا بھی اچھا نہ لائے۔

اللہ ہی جانتا ہے کہ بیویوں کو یہ وہم کیوں ہوتا ہے کہ ان کی شادی پاگل

غلط جگہ ہوئی ہے۔ والدین نے بغیر سوچے سمجھے ان کو جہنم میں جھونک دیا ہے۔ یہ بات اکثر میاں کو جتا بھی دیتی ہیں کہ اگر ان سے شادی نہ ہوتی تو ضرور کسی سیٹھ یا لیڈر سے ہوتی چاہے وہ بوڑھا ہی ہوتا مگر ان کا خیال تو رکھتا۔

آپ سب سے بڑے مجرم ہوں گے۔ اگر آپ کسی سسرال والے کی شان میں کچھ کہہ دیں گے۔ بیگم صاحبہ یہ بھی برداشت نہ کریں گی گو وہ بات جو آپ کہیں سچی ہی ہو۔ یاد رکھیے بیوی اپنے والدین کی "سوکالڈ وکیل" ہوتی ہے۔ اگر آپ بھولے سے یہ شکوہ کریں کہ "بیگم صاحبہ آپ کے والد محترم کا کتا بڑا بدذات ہے کمبخت بھونکتا بھی ہے اور کاٹتا بھی ہے جو انگریزی اصول کے بالکل خلاف ہے"

بس آپ کی شامت آجائے گی، اور کتے کی وکالت شروع ہو جائے گی۔

"اچھا آپ ٹامی غریب کو کہہ رہے ہیں وہ بے چارہ تو بہت سیدھا سادا ہے اور چپ چاپ رہتا ہے، ابا جان نے نواب سلار و سے خریدا تھا۔ نواب صاحب خود فرانس سے لائے تھے۔ تمام کتوں سے قیمتی کتا تو ٹامی ہے۔ آپ کو تو خواہ مخواہ اس کتے سے ضد ہے"

اب آپ بحث کرنے کی کوشش نہ کریں۔ بھلائی اسی میں ہے کہ لیلیٰ کے باپ کا کتا سمجھ کر خاموش ہو جائیں۔

اکثر ایسا اتفاق ہوا ہے کہ جس دن کوئی دوست آپ کے ساتھ کھانا کھانے کے لیے گھر آجائے اور اس بات کی اطلاع بیگم صاحبہ کو پیشتر سے نہ ہو تو اس دن ضرور کوئی ایسی چیز کھانے کو ملے گی جو یقیناً آپ کو ناپسند ہو گی۔ نہ جانے ان بیویوں کو کیسے الہام ہو جاتا ہے کہ آج ایک ناخاندہ مہمان آ رہا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے۔ گو آپ بعد میں بندوبست کروا لیتے ہیں کہ کوئی اور چیز بھی جلدی بن جائے۔

اگر آپ پہلے ہی بیگم صاحبہ کو اطلاع دے دیں کہ آج ایک دوست رات کھانا ہمارے ہاں کھائیں گے تو جرح شروع ہو جائے گی۔

"کون ہیں یہ دوست۔ آپ ہی ہیں جو لوگوں کو کھلاتے رہتے ہیں۔ کسی نے کبھی آپ کو بھی کھانے پر بلایا ہے؟"

آپ بیگم صاحبہ کو یاد دلاتے ہیں "ابھی کل ہی تو ڈاکٹر محمود کے یہاں کھانے پر گیا تھا۔"

ارشاد ہوگا "کھانا کہاں تھا اُن کے والد کا ختم تھا۔ یتیم خانے والوں کو بلایا تھا اور لوگوں کو بلایا تو آپ کو بھی بلالیا وہ کوئی کھانا تھا۔"

آپ پھر سوچ کر یاد دلاتے ہیں "دس پندرہ دن ہوئے میاں فضل کریم کے یہاں پُر تکلف دعوت پر مدعو تھا۔"

پھر ارشاد ہوگا "کیا ہوا جو دو سال میں کسی نے ایک بار بلالیا — مگر یہاں تو روز مرّہ کا دستور ہے۔ آج قریشی صاحب کھانے پر آرہے ہیں، کل رؤف صاحب اور پرسوں اقبال صاحب کی چائے ہے۔ ہاں! میں پوچھتی ہوں یہ اب کون تشریف لا رہے ہیں کہیں وہ موٹا صادق تو نہیں خدا کی پناہ! گذشتہ روز کھانے پر غضب کردیا اُس نے۔ کہنے لگا کھانا کھا کر آیا ہوں اور پھر ڈٹ گیا۔ میں تو حیران رہ گئی کہ اتنا کھانا کہاں بھرتا جارہا تھا۔ کھانا کھا کر آیا تھا پھر اتنا کھا گیا کہ کوئی بھوکی بھینس کیا کھائے گی۔ ہفتہ بھر کا راشن ایک ہی بار میں ختم کر گیا اگر وہی ہے تو بتا دیجیے تاکہ دیگ منگوا لوں۔ ہمارے بس کا تو یہ روگ نہیں۔"

بیویوں کے کان میں نہ جانے کس نے پھونک دیا ہے کہ ان کے خاوند ان کا خیال مطلق نہیں رکھتے بلکہ ان کی سہیلیوں کے خاوند اپنی بیویوں کا بہت خیال رکھتے ہیں اور ان پر اس طرح جان چھڑکتے ہیں جس طرح چھڑکاؤ کی لاری سڑک

پر پانی چھڑکتی ہے۔

بیگم صاحبہ کا یہ گلہ تو کبھی جاتا ہی نہیں کہ جب سے شادی ہوئی ہے صحت کا ستیاناس ہو گیا ہے، حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اور آپ کو ذرہ بھر بھی پروا نہیں۔ کبھی باقاعدہ علاج تک نہیں کرایا۔ آپ تو چاہتے ہی ہیں کہ راستہ صاف ہو اور ہم عیش کریں مگر میں بھی آسانی سے جان چھوڑنے والی نہیں۔"

عرض کیا۔ "مجھ پر تو زبردستی الزام لگایا جا رہا ہے، علاج آپ خود باقاعدہ نہیں کراتیں۔ آدھی سے زیادہ تنخواہ دواؤں پر خرچ ہو جاتی ہے۔ ویسے ماشاءاللہ شادی سے پہلے آپ کون سی "حمیدہ پہلوان" تھیں۔

فرمانے لگیں: "ذرا میری شکل دیکھیے کیا سے کیا ہو گئی ہے، آپ سے تو کبھی اتنا بھی نہ ہوا کہ شام کو سیر کے لیے ہی لے چلیں۔"

لیجیے اب آپ کلب چھوڑ کر سیر کا پروگرام بنائیے۔ دنیا اور آخرت میں بھلا ہو گا۔

اِک تیرے آنے سے پہلے

مارشل لا کے نفاذ سے دس سال پہلے ہمارا ملک پاکستان معرض وجود میں آیا۔ اس مختصر عرصے میں ملک کو جو ترقی اور خوش حالی نصیب ہوئی اور جس طرح اس ملک سے غربت اور تنگدستی کو دور کیا گیا دنیا کا کوئی دوسرا ملک نہ کر سکا اور نہ کر سکے گا ملک کی خوشحالی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آدھے سے زیادہ ملک وزیروں نائب وزیروں اور سفیروں سے بھرا ہوا تھا۔ اور اسلامی اصول کے مطابق یہاں یہ وزارت میں عورتوں کو مساوی حقوق دیے گئے تھے۔ جتنے وزیر اس ملک میں مینوفیکچر ہوئے اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ہمارے وزیروں نے اپنی ان تھک کوششوں سے مفلسی اور غربت کو دور کرنے کی مقدور بھر کوشش کی۔ چنانچہ افلاس کی بیخکنی کے لیے انھوں نے اپنی اولاد قریبی رشتہ داروں دوستوں اور اُن کی اولاد در اولاد کو بزنس میں ڈال کر ٹھیکے، روٹ پرمٹ، اور امپورٹ لائسنس دیے۔ ان کی غربت کا دور ہونا کسی حد تک ملک سے غربت کا دور ہونا تھا۔ یوں تو سبھی خدا کے بندے ہیں لیکن بندوں کے بھی درجے ہوتے ہیں یعنی ماں، باپ، بہن بھائی، اولاد، رشتہ دار، عزیز اور دوست وغیرہ وغیرہ اور پھر عوام۔ یہ سلسلہ درجہ بدرجہ طے ہو رہا تھا اور ابھی بیچارے وزراء وغیرہ وغیرہ تک نہ پہنچے تھے کہ مارشل لا آن پہنچا اور عوام کا نمبر آنے سے رہ گیا۔ ویسے یہ آں مکانی وزیر بڑے نیک دل لوگ تھے، آخر دم تک غربت مٹانے کی کوشش کرتے رہے۔ کیسی

نے اپنی بیوی کو روٹ پرمٹ دلوایا۔ کسی نے اپنی لڑکی کو امپورٹ لائسنس دیا۔ اب اُس نے ملک کی بہتری کے لیے کیا کچھ امپورٹ کیا۔ اسے راز ہی رہنے دیجیے۔ کسی نے عزیز از جان برخوردار سعادت اطوار کو بلڈنگ بنانے یا سپلائی کا ٹھیکہ دیا۔ یہ مت پوچھیے کہ بلڈنگ تعمیر ہونے سے پہلے ہی کیوں گر گئی یا جو مال سپلائی کیا گیا وہ کس قسم کا تھا یا سپلائی بھی ہوا یا نہیں مطلب تو دراصل اپنے ملک کے اچھے خاصے غریب طبقے کی مفلسی دور کرنا تھا جو پورا کیا گیا۔

انھوں نے ہماری بہبود کے لیے "لارا لپا اور ادھی ٹپا" سکیمیں بنائیں اور ہمیں خوش کیا گیا۔ اگر یہ سکیمیں خدانخواستہ کامیاب ہو جاتیں تو ہمارے ملک میں اور بہشت میں کوئی فرق نہ رہتا۔ پانی کے نلکوں سے دودھ نکلتا، کنوؤں میں سے دہی کی لسی نکلتی اور دریاؤں میں ماءُاللحم بہتا نظر آتا۔ ان کے یہ اعلانات کہ ملک خوشحال ہے، ملک میں سونا ہی سونا ہے۔ مسرت کی لہر دوڑا دیتے تھے اور ان اعلانوں کو کون جھٹلا سکتا تھا۔ سونے کی ملک میں اتنی ارزانی اور بہتات تھی کہ عوام کو اکثر سوتے ہی دیکھا۔ ہمارے وزیروں کی یہی کوشش رہی کہ جو جاگ رہے ہیں وہ سو جائیں اور جو سو رہے ہیں وہ خوابِ خرگوش میں مدہوش ہو جائیں اور اُن کے ترقی کے کاموں میں حارج نہ ہوں اور ہر طرح امن و امان میں رہیں۔ دنیا کی مصیبتوں اور مشکلات سے دور رہیں اور وہ خود قوم اور عوام کے غم میں ڈنر زہر مار کرتے رہیں اور نئے سے نئے ماڈل کی کاروں میں دھکے کھاتے رہیں۔

ادھر ہمارے تاجر بھائیوں نے بھی ملک کو خوش حال بنانے میں بڑی مدد دی۔ بنیے کا اصول تھا کہ بکری زیادہ اور منافع کم۔ ہمارے تاجر

بھائیوں نے اس اصول کو اُلٹ کر رکھ دیا۔ یعنی منافع زیادہ بکری کم جتنا منافع بنیا دس سال میں کماتا تھا، انھوں نے دس دن میں پیدا کیا۔ اور ہمیشہ آنے والے گاہک کے بارے میں یہی سوچا کہ ممکن ہے پھر ملاقات نہ ہو لہٰذا ایک ہی بار کھال سمیت، کپڑے اُتار لیے جائیں۔ بنیا تو ویسے ہی ڈرپوک تھا وہ چیز بھی بیچتا تھا۔ منافع بھی کم لیتا تھا اور پھر ساتھ ساتھ ہاتھ بھی جوڑتا تھا۔ اِدھر ہمارے بھائیوں نے مال بھی ٹھاٹھ سے بیچا۔ منافع بھی خوب کمایا اور گاہک سے ہاتھ بھی جڑوالئے۔ کیا یہ ترقی نہیں ؟۔

اِسی بزنس کے بہانے تاجر بھائیوں نے حج بھی کیے اور ساتھ کے ساتھ بزنس بھی۔ اپنی دنیا بھی بنائی اور عاقبت بھی۔ یہاں سے اصلی "ڈپنچر" لگاکر حج چلے گئے اور واپسی پر سونے کا "ڈپنچر" لگوا آئے۔ یہ لوگ ہم خرما و ہم ثواب کے قائل تھے۔

باہر کے ممالک سے تجارت میں ہم نے نہایت فراخ دلی سے کام لیا۔ اُن کو بادام بھیج کر اپنے لیے مونگ پھلی حاصل کی۔ پستہ دے کر چلغوزے منگوائے۔ اس طرح سے غیر ممالک سے خوشگوار تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی۔

دفتروں میں کام کا شہرہ عام تھا۔ آزادی اور سہولتوں کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ جس کا جس وقت دل چاہتا تھا دفتر آتا تھا۔ اگر موڈ نہ ہوتی نہ آتا تھا۔ جس وقت طبیعت چاہتی تھی کام کرتا تھا۔ دفتر کا کام کرنا فرض نہیں تھا بلکہ کام کرنے والوں کی موڈ پر منحصر تھا۔ کام نہ کرنے سے کبھی دفتروں کے کام رُکے ہیں۔ ایسی سہولت اور کس ملک کے دفتروں میں میسر ہوگی۔ پھر دفتروں میں روپیہ پیسہ کی بڑی فراوانی تھی۔ پبلک کی سہولت کے لیے ہر بات کی فیس مقرر تھی کیونکہ

لوگوں کے پاس اتنا فالتو روپیہ اکٹھا ہوگیا تھا۔ کہ ان کو خرچ کرنے کے ذرائع معلوم نہ تھے۔ روپیہ کو ٹھکانے لگانے کا سہل طریقہ یہ نکالا گیا کہ اگر دفتر کے بابو سے سلام کا جواب لینا ہو تو فیس ادا کی جائے یعنی بات بات اور قدم قدم پر فیس مقرر تھی اور کہا جاتا ہے کہ لوگ اپنے کام کی خاطر بخوشی مقررہ فیس ادا کرتے تھے اور یہی فیس اپنا کام ہو جانے کے بعد کاروبار میں وصول کر لیتے تھے۔

یہ بات اکثر لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب اپنے ملک کے لوگوں کا دل و دماغ شکل وصورت بالکل ایسی ہے جیسے دوسرے ملک کے لوگوں کی تو پھر کیا وجہ ہے کہ یہ سائنس اور دیگر ایجادات میں سب سے پیچھے ہیں۔ دوسرے ملک کے لوگ "مصنوعی سیارے" اڑاتے ہیں اور ہم ابھی تک پتنگیں اور کبوتر ہی اُڑا رہے ہیں۔ دوسرے ممالک میں اپنے "دفاع" کی خاطر خوب تیاریاں ہوتی ہیں، ایٹم اور ہائیڈروجن بم کے بعد راکٹ بنائے جا رہے ہیں اور ہم ابھی تک بٹیر اور مرغ لڑانے میں مشغول ہیں۔ زمانہ وقت کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور ہم گھڑیاں آگے بڑھا کر زمانے کو آگے بڑھا رہے ہیں اور خود پیچھے بھاگ رہے ہیں مگر حیرت کی بات ہے کہ ناسمجھ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ دس سال کے عرصے میں ہم نے کیا کچھ کمال کی چیزیں ایجاد کی ہیں۔ ہمارے تجارتی سائنس دانوں نے کمال کی چائے بنائی۔ چائے کی پتی کا نام ونشان نہ تھا۔ مگر پھر بھی چائے کا مزہ دیتی تھی۔ چنے کے چھلکوں کا چورا کر کے رنگ دے دیا اور چائے بن گئی، اور یہ چائے دس سال تک کامیاب رہی۔

نمک بغیر نمک کے بنایا گیا، مرچوں میں اینٹوں کا پاؤڈر ملا کر ذائقہ خوشگوار کیا گیا۔ عوام نے ان چیزوں کو اصلی چیزوں کے داموں پر خریدا اور بخوشی استعمال کیا۔ اور اصل اور نقل میں امتیاز نہ کر سکے۔

نادر الوجود گائے اور بھینسوں کے دودھ سے مکھن اور گھی تیار کیا گیا اور نا خالص ثابت کرنے والے کے لیے پانچسو روپے کا انعام بھی رکھا گیا۔ کوئی غلط ثابت کر کے انعام حاصل نہ کر سکا۔ سوہن حلوے میں ایسا گھی ملایا کہ کھانے والا سائیکل کی طرح اوور ہال ہو جاتا تھا۔ اس کے تمام پرزوں میں خود بخود گریز آ جاتا تھا۔ اور بعض اوقات بیٹھے بیٹھے آدمی کے اعضاء خود بخود ہلنے لگتے تھے۔ ان تمام ایجادات کا نتیجہ لوگوں کے حق میں بہت اچھا ثابت ہوا۔ ایسی خالص ایجادات کے استعمال سے چنگے بھلے چلتے پھرتے انسانوں کے ہارٹ فیل ہونے لگے۔ در اصل ان خالص غذاؤں میں طاقت بہت زیادہ تھی۔ جسے دل نہ سنبھال سکتا تھا۔ اور جیسے زیادہ کرنٹ آنے سے بلب فیوز ہو جاتا ہے اسی طرح دل فیل ہو جاتا تھا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ لمبے عرصے تک مرض جھیلنے سے نجات ملی۔ سسک سسک کر جان دینے سے چھٹکارا ملا۔ آدمی گھر سے ولیمہ کھانے نکلا مگر وہاں جا کر اپنا چہلم ہو گیا۔

دس سال میں ملیں اور فیکٹریاں بھی بنائی گئیں فیکٹریاں کچھ اس انداز سے بنائی گئیں کہ ایک خاص چیز کی فیکٹری میں بیک وقت دوسری چیز بھی بن سکتی تھی۔ بسکٹ بنانے کی فیکٹری میں سائیکل بنائے جا سکتے تھے۔ اسلحہ بنانے کی فیکٹری میں برتن اور سٹوو یعنی انگریزی چولھے بن سکتے تھے۔ فیکٹریوں میں گو مشینوں کی کمی تھی اور اس کمی کو حد سے زیادہ عملہ بھرتی کر کے پورا کر دیا گیا۔ ایک سیکشن میں اگر چھ کلرک تھے تو ان کی نگرانی کے لیے سات افسر مقرر کر دیے گئے۔ کیا کسی ملک میں ہر نتھو فتو کا افسر بن جانا فی نفسہٖ ملک کی خوشحالی کی دلیل نہیں۔

ایک اور چیز میں بھی ترقی ہوئی، وہ ہیں کاریں۔ کاروں کا یہاں بہت زور شور ہوا۔ اپنے ملک میں سائیکل کم اور کاریں زیادہ نظر آتی تھیں۔ اور نئے سے نئے

ماڈل کی کاریں سڑک پر دیکھی جا سکتی تھیں۔ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جن ملکوں میں کاریں بنتی ہیں وہاں یہ اتنی کاریں نہ ہوں گی جتنی کہ اس ملک میں دس سال کے عرصے میں جہیا کی گئیں۔

اس طرح سے آرائش و زیبائش کی اشیاء کی بھی فراوانی رہی۔ اس ملک میں آٹے سے زیادہ فیس پاؤڈر تھا، اگر کسی گھر میں کسی دن آٹا نہ ہوتا تھا تو وہاں پاؤڈر کے خوشبودار پھلکے بن سکتے تھے۔ کریمیں مکھن کی جگہ استعمال کی سکتی تھیں لپ سٹک وغیرہ کا تو اندازہ نہ تھا۔ وقت پڑنے پر کھائی بھی جا سکتی تھی اور پانی میں گھول کر بطور شربت پی بھی جا سکتی تھی۔ اور اگر کسی دن ضرورت پڑے تو ہنڈیا میں مرچ مصالحے کا رنگ بھی دے سکتی تھی۔

انجام کار ہر کمالے را زوالے کے مصداق عزیزہ واقربا کی غربت کا وہ ہونا رنگ لایا اور یہ رنگ مارشل لا کے نفاذ کی صورت میں ظاہر ہوا۔

اب وہ سے صورتیں جانے کہاں جا بسیں جن کے دیکھنے کو اکھیاں ترستیاں ہیں ؟

"ہاتھ کی لکیریں"

غیب کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں لیکن وہ کسی کو بتاتے نہیں۔ تاہم ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر انسان کی قسمت یا اُس کا کیریکٹر۔ عادات و اطوار بتانا ایک ایسا علم ہے جو کوشش سے حاصل کیا جا سکتا ہے، ویسے تو اس موضوع پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن وہ کبھی ختم نہ ہو سکے گی کیونکہ یہ علم بہت وسیع ہے۔

ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر قسمت یا عادات و اطوار بتانا بہت آسان ہے صرف الفاظ کا ہیر پھیر ہے۔ اگر آپ الفاظ کے ہیر پھیر میں ماہر ہیں تو یہ علم بہت جلد سیکھ سکیں گے۔ آپ اپنے دوست احباب کی تقدیر آسانی کے ساتھ بتا سکیں گے اور اگر کمانا چاہیں تو بغیر کسی تردد کے بازار میں کسی نالی کے قریب دری بچھا کر یہ کاروبار شروع کر سکتے ہیں۔ اللہ روزی دینے والا ہے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہاتھ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک دایاں ہاتھ اور دوسرا بایاں ہاتھ قسمت کی لکیریں صرف دائیں ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ بائیں ہاتھ میں صرف نمونے کی لکیریں ہوتی ہیں۔ یا اگر کسی شخص کا دایاں ہاتھ زخمی ہو، ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی ہو یا بد قسمتی سے دایاں ہاتھ کٹ گیا ہو یعنی بالکل غائب ہو تو پھر بائیں ہاتھ کی لکیروں سے ہی اندازہ لگانا پڑے گا۔ بالفاظ دیگر بائیں ہاتھ کو مددگار ہاتھ کہا جا سکتا ہے۔

ہاتھ میں بڑی بڑی اور دیکھنے کے لائق لکیریں صرف تین ہوتی ہیں پہلی

دل، دوسری دماغ اور تیسری عمر کی لکیر ہوتی ہے۔ اب میں آپ کو الگ الگ ہر لکیر کے متعلق بتاتا ہوں کہ یہ کہاں ہوتی ہے اور کیا ظاہر کرتی ہے۔

سب سے پہلے دل کی لکیر کو لیجیے۔ یہ لکیر چھوٹی انگلی کے نیچے سے شروع ہو کر شہادت کی انگلی کے قریب جا کر ختم ہوتی ہے۔ یہ وہ تمام باتیں بتاتی ہے جن کا دل کے ساتھ تعلق ہوتا ہے، مثلاً محبت، دل کی نرمی سختی، دل کی اچھائی یا برائی، کمزوری وغیرہ وغیرہ

اگر یہ لکیر کسی کے ہاتھ میں بہت صاف اور گہری ہے تو آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسے ہاتھ کا مالک محبت کے معاملے میں بہت گہرا ہوگا۔ سچا اور دل کا صاف ہوگا۔ اب اگر آپ الفاظ کے ہیر پھیر میں ماہر ہیں تو یہ سوچ لیں کہ جو شخص محبت میں بہت گہرا اور سچا ہوگا وہ کس قسم کا ہوگا۔ ایسی تمام باتیں جن کا ایسے شخص پر اطلاق ہو سکتا ہے بغیر خوف کے بتا دیں یعنی ایسا شخص محبت کے معاملے میں گہرا اور سچا ہونے کی وجہ سے سب کچھ کر گذرے گا۔ اگر والدین عزیز و اقارب کو بھی چھوڑنا پڑے تو دریغ نہ کرے گا۔ بہت نڈر ہوگا۔ محبت میں خرچ بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے اپنا مطلب پورا کرنے کے لیے فضول خرچ بھی ہوگا۔ ہر قسم کا خطرہ بھی مول لے گا۔ اس لیے بہت سے کام بلا سوچے سمجھے کرے گا۔ اور جب بلا سوچے سمجھے کام کرے گا تو اکثر غلطی بھی کرے گا اور دھوکا بھی کھا جائے گا۔ وہ شخص جو دھوکا کھا جائے یقیناً بدھو ہوتا ہے۔ بس آپ بات میں سے بات نکالتے جائیں الفاظ میں سے الفاظ نکال کر جال بنتے جائیں لیکن جال اس طریقہ سے بنیں کہ وہ شخص اس میں پھنس کر رہ جائے اور آپ کے کمال کا قائل ہو جائے۔ ایک بات اور یاد رکھیے کہ اگر دس باتوں میں سے صرف دو باتیں درست نکل آئیں تو آپ اپنے ہنر میں کامیاب ہیں، دو باتوں کا سچ نکل

آنا بعید نہیں اور وہ شخص آپ کو مان جائے گا۔ انسان کی فطرت کچھ اس قسم کی واقع ہوتی ہے کہ اگر دس میں سے دو باتیں درست نکل آئیں تو وہ صرف ان دو باتوں کو ہی یاد رکھے گا، باقی آٹھ غلط باتوں کو بھول جائے گا۔

اگر دل کی لکیر بالکل صاف اور گہری ہے تو محبت میں کامیابی ہوگی اور ہلکی ہے تو مشکلات درپیش ہوں گی۔ اور اگر لکیر درمیان میں سے ٹوٹی ہوئی ہے تو اس کا مطلب صاف ظاہر ہے کہ دل ٹوٹ جائے گا محبت ناکام رہے گی وغیرہ وغیرہ اور اگر دل کی لکیر پر یا لکیر کے قریب کہیں گول دائرہ نظر آجائے تو کہہ دیجیے کہ محبت میں ناکامی ہے انجام خودکشی ہوگا۔ اور وہ بھی کنوئیں میں ڈوب کر۔ کیونکہ کنواں ہی گول ہوتا ہے میں نے آپ کو رستے پر لگا دیا ہے۔ آپ اسی طرح دل کی اچھائی بُرائی۔ نرمی سختی کا اندازہ لگا کر لفظوں کا جال بُن دیں۔

دل کی لکیر کے بعد دماغ کی لکیر آتی ہے۔ یہ شہادت کی انگلی کے نیچے سے شروع ہو کر تیسری انگلی کے نیچے جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ یہ لکیر ان تمام صفتوں کو ظاہر کرتی ہے جن کا تعلق دماغ کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ جتنی گہری اور صاف ہوگی اتنا ہی اچھا اس شخص کا دماغ ہوگا۔ اب پھر وہی پہلے والی بات آجاتی ہے کہ جب آپ کو معلوم ہو جائے کہ یہ شخص اعلیٰ دماغ کا مالک ہے۔ آپ اپنے اعلیٰ دماغ سے کام لیجیے اور وہ تمام صفات جو اعلیٰ دماغ کے مالک میں ہونی چاہییں۔ اس شخص کی طرف منسوب کر دیں۔ مثلاً آغاز یوں کیجیے کہ وہ بہت ہوشیار ہے۔ ہر بات کی تہ تک بہت جلد پہنچ جاتا ہے۔ ہر مشکل کام کو جلد سلجھا سکتا ہے، سوچیے کہ جو شخص ہوشیار ہوگا وہ چالاک بھی ہوگا۔ اگر کوئی عام آدمی ہے تو آپ اس کے لیے چالاک کا لفظ استعمال کیجیے، کوئی بڑی ہستی ہے تو پھر کہیے کہ وہ بڑا زیرک ذہین ڈپلومیٹ ہے۔ الفاظ کا ہیر پھیر یاد رکھیے۔ جب آدمی مشکل سے مشکل کام کر سکتا

ہے تو یقیناً نوسے فی صدی کامیاب بھی رہتا ہے، ایک بات اور یاد رکھیے انسان اپنی تعریف بہت پسند کرتا ہے چاہے غلط ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اس کو بالکل اسی طرح سمجھے گا کہ واقعی یہ سب خوبیاں اُس میں ہیں۔

اب اگر دماغ کی لکیر ہلکی ہے تو ظاہر ہے کہ دماغ کم ہے اور یقیناً بھس بھرا ہوا ہے۔ اب خود سوچ لیجیے کہ ایسا شخص جس میں دماغ کی کمی ہو اور بھس کی زیادتی ہو کن صفات کا مالک ہوگا، بس وہ صفتیں گن دیجیے، مثلاً دماغ کم ہے۔ بے وقوف ہے۔ اس لیے خود اعتمادی نہ ہوگی۔ دوسروں پر اعتماد اور بھروسہ کرے گا ہر مشکل کام میں ہاتھ ڈالتا ہوا ڈرے گا۔ اگر ہاتھ ڈال بیٹھے گا تو ناکام رہے گا۔ سوسائٹی میں کم عزت حاصل کرے گا۔ دنیا میں ترقی نہ کر سکے گا۔ دماغ کی کمی کی وجہ سے ضدی بھی ہوگا بس بات میں سے بات نکالتے جائیے۔

اس جگہ ایک ضروری بات کا خیال رکھیے وہ یہ کہ جس شخص کا ہاتھ آپ دیکھ رہے ہیں اُس کی شخصیت کا ضروری خیال رکھیے گا۔ اگر کوئی جاہل یا گنوار ہے تو آپ اُس کو کم عقل بے وقوف کہہ سکتے ہیں۔ اگر کوئی پڑھا لکھا اور صاحب حیثیت شخص ہے تو آپ اُس کو بے وقوف یا کم عقل نہ کہیں کیونکہ وہ بُرا مان جائے گا۔ کسی کو بے وقوف بنانے کے اور بہت سے آسان طریقے ہیں۔ مثلاً آپ کہیے کہ وہ بہت ہی سیدھا سادا انسان ہے ہر ایک کی بات پر جلد ایمان لے آتا ہے۔ بالکل سادہ لوح ہے ہر ایرے غیرے کے کہنے کا یقین کر لیتا ہے۔

دماغ کی لکیر کے پاس تھوڑے فاصلے پر ویسی ہی ایک اور لکیر ہوتی ہے اس کو دماغ کی ڈبل لکیر کہتے ہیں جس شخص کے ہاتھ میں دو لکیریں ہوں اُس کی صلاحیتوں کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ لکیر بہت کم ہاتھوں میں نظر

آتی ہے۔ اگر یہ لکیر دیکھنے کی خواہش ہو تو آکر میرا ہاتھ دیکھ لیجیے۔

تیسری بڑی لکیر عمر کی لکیر ہے۔ یہ لکیر شہادت کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان سے شروع ہو کر انگوٹھے کے گرد گھیرا ڈالتی ہوئی کلائی تک جا پہنچی ہے اس کے متعلق بتانا سہل ہے، یہ لکیر انسان کی عمر کو ظاہر کرتی ہے۔ اگر لکیر صاف گہری اور لمبی ہے تو ظاہر ہے کہ عمر اچھی اور لمبی ہو گی۔ اگر لکیر ہلکی اور چھوٹی ہے تو عمر بھی چھوٹی ہو گی۔ اگر لکیر گہری ہے لیکن درمیان میں کسی جگہ ہلکی ہو گئی ہے تو یقیناً اس عمر پر پہنچ کر حادثہ یا بیماری سے دوچار ہونا پڑے گا۔ لیکن آدمی بچ جائے گا۔ اگر لکیر کہیں سے ٹوٹ جائے تو اس عمر میں جا کر آدمی مر جائے گا اگر خدانخواستہ نہ مرے تو اسے مر جانا چاہیے۔ کیونکہ عمر کی لکیر کا یہی تقاضہ ہے اگر یہ لکیر صاف ہے اور اس پر کسی قسم کا نشان نہیں۔ تو عمر صاف ستھری اور آرام سے گذرے گی۔

اگر اس لکیر پر اور لکیریں ہیں یا ضرب اور جمع تقسیم کے نشانات ہیں تو عمر ضرب تقسیم میں ہی گذرے گی۔

اگر عمر کی لکیر نیچے کلائی کے پاس دائیں طرف مڑ جائے تو اس شخص کے لیے اپنے ملک سے باہر جانے کا کوئی امکان نہیں۔ چاہے جتنی بھی کوشش کرے۔ سوا اس کے کہ مر کر دوسرے ملک میں چلا جائے لیکن وہاں سے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں۔

اگر یہی لکیر کلائی کے پاس بائیں طرف مڑ جائے تو اس شخص کو یقیناً سمندر کا سفر درپیش ہو گا۔ وہ شخص ضرور انگلستان، امریکہ یا جاپان وغیرہ جائے گا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس شخص کو کالے پانی جانا پڑے اس لیے اس لکیر سے خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔

ان بڑی لکیروں کے علاوہ کچھ چھوٹی لکیریں بھی ہوتی ہیں۔ میں صرف دو ایک چھوٹی لکیروں کے متعلق آپ کو بتاتا ہوں۔ جن کا ذکر ضروری ہے۔

انسان کے ہاتھ میں ایک تقدیر یا قسمت کی لکیر ہوتی ہے۔ یہ لکیر کلائی کے درمیان سے شروع ہو کر درمیانی انگلی کی طرف جاتی ہے، اگر یہ لکیر گہری ہے اور بالکل سیدھی درمیانی انگلی تک جاتی ہے تو اچھی قسمت ظاہر کرتی ہے۔ اور وہ شخص امیر ہوگا قسمت کا دھنی ہوگا۔ اگر یہ لکیر ہلکی ہے اور ٹوٹ ٹوٹ کر انگلی کی طرف جاتی ہے تو ظاہر ہے کہ قسمت بھی ہلکی اور ٹوٹی پھوٹی ہوگی۔ آدمی قلاش، غریب مفلس اور مقروض رہے گا۔ جہاں آپ کو قسمت کی لکیر کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو سکے وہاں پر ایک ہی قسم کے فقرے کہیے۔ مثلاً آپ کے پاس پیسہ جمع ہم ہی نہیں سکتا۔ آپ ایک کماتے ہیں اور دو خرچ کرتے ہیں (دوسرا روپیہ کہاں سے آئے گا یہ نہ بتائیے)۔ آپ کی ویسے ہر حاجت پوری ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ ان باتوں سے لوگ بہت خوش ہوتے ہیں۔

اگر قسمت کی لکیر دماغ کی لکیر تک جا کر رک جائے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شخص کا دماغ اتنا قابل ہے کہ اس نے ترقی کو روک دیا۔

اور اگر قسمت کی لکیر دل کی لکیر کے نیچے جا کر رک جائے تو ظاہر ہے کہ حضرت دل نے اپنی حماقتوں اور مہربانیوں سے آئندہ ترقی کے راستے مسدود کر دیے ہیں۔ اور اگر یہ لکیر کلائی سے شروع ہو کر دو انگلیوں کے درمیان سے ہاتھ کی پشت پر ڈیڑھ انچ کے قریب جا نکلے تو وہ شخص جس شخص کے ہاتھ میں ایسی لکیر ہوگی یقیناً بادشاہ ہوگا۔ (دیکھیے پان کے بادشاہ کا ہاتھ) اگر ایسی لکیر کسی عورت کے ہاتھ میں ہو تو یقیناً ملکہ ہوگی۔ (حکم کی ملکہ کا ہاتھ ملاحظہ ہو)۔ یہ راز میں آپ پر فاش کر دوں کہ ایسی لکیر ہر عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہے کیونکہ ہر عورت حاوتد پر حکم

چلاتی ہے لہذا حکم کی ملکہ ہوتی ہے۔

اگر کسی شخص کے ہاتھ میں قسمت کی لکیر کے قریب ہی ایسا نشان ہو جیسے جھاڑی ہوتی ہے یا گھوڑے کی دُم۔ تو ایسا شخص بہت بڑا آدمی ہوتا ہے گھوڑوں کا بیوپار کرتا ہے یا گھوڑوں کا مالک ہوتا ہے اور ریس کھیلتا ہے۔ زیادہ تر یہ نشان کمہاروں کے ہاتھ میں نظر آتا ہے جو گدھوں کے مالک ہوتے ہیں۔

انسان کے لیے سب سے دلچسپ شادی کی لکیر ہوتی ہے۔ یہ لکیر چھوٹی سی ہوتی ہے اور چھوٹی انگلی کے قریب۔ اس کے متعلق عام بات مشہور ہے کہ اس جگہ جتنی لکیریں ہوں گی اُتنی ہی شادیاں ہوں گی۔ یا اتنی ہی عورتوں سے لگاؤ ہوگا اگر عورت کے ہاتھ میں بھی شادی کی زیادہ لکیریں ہیں تو اس کے متعلق بھی یہی اندازہ کیجیے۔ اگر خاوند کے ہاتھ میں شادی کی ایک لکیر ہے اور بیوی کے ہاتھ میں دو لکیریں ہیں اور بیوی کی یہ پہلی ہی شادی ہے تو اس کا مطلب پانی کی طرح صاف ہے یعنی میاں کی خیر نہیں۔ اس کا کونڈا ہو کر رہے گا یا طلاق ہو جائے گی جس سے بیوی کو دوسری شادی کا موقع ملے گا۔ اگر خاوند کے ہاتھ میں دو لکیریں ہوں تو یہی معاملہ بیوی کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے۔ اس لیے بیویوں کو خوش نہیں ہونا چاہیے۔

اگر شادی کی لکیر ذرا چھوٹی ہے تو فوراً کہہ دیں کہ چھوٹی عمر میں شادی ہوگی اور اگر لکیر ذرا بڑی ہے تو شادی بڑی عمر میں ہوگی، ریٹائر ہونے کے قریب یا پنشن پانے کے بعد۔ اگر لکیر حد سے زیادہ لمبی ہے تو پھر شادی کی ایک ہی صورت ہے اور وہ انتقال کے بعد۔

اگر کسی شخص کے ہاتھ میں شادی کی لکیر غائب ہو تو ایسے شخص کی شادی ہرگز نہ ہوگی اور اگر ہو گی بھی تو اس عورت کے ساتھ جس کے ہاتھ میں بھی شادی کی

لکیر غائب ہوگی۔ یہ شادی کی لکیر کا اصولِ خاص ہے۔

شادی کی لکیر کے اوپر اکثر چھوٹی چھوٹی لکیریں نظر آتی ہیں۔ یہ لکیریں بچوں کی تعداد کو ظاہر کرتی ہیں۔ اور اگر دو لکیریں ہوں تو دو بچے ہوں گے اگر تین ہوں تو تین بچے۔ غرض جتنی لکیریں ہوں گی اتنے ہی بچے ہوں گے۔

بچے چونکہ میاں بیوی کا مشترکہ مال ہوتا ہے۔ اس لیے جتنی لکیریں میاں کے ہاتھ میں ہوں اتنی ہی لکیریں بیوی کے ہاتھ میں بھی ہونی چاہییں۔ اگر میاں کے ہاتھ میں تین لکیریں ہیں تو بیوی کے ہاتھ میں بھی تین لکیریں ہونی چاہییں۔ اگر میاں کے ہاتھ میں دو لکیریں ہیں اور بیوی کے ہاتھ میں تین تو اس کا مطلب صاف لفظوں میں یہ ہوگا کہ دو بچے تو ان کے مشترکہ ہوں گے لیکن بیوی کے ہاتھ میں میاں کی نسبت ایک لکیر زیادہ ہے۔ اس لیے ایک بیوی کا ذاتی بچہ ہوگا۔ اسی طرح اگر خاوند کے ہاتھ میں ایک لکیر زیادہ ہے تو ایک اس کا ذاتی بچہ ہوگا۔

ان چھوٹی لکیروں کے علاوہ اور بہت سے نشانات بھی ہاتھ میں ہوتے ہیں جن میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

اگر کسی شخص کے ہاتھ میں ایسے نشانات ہوں جیسے انگریزی میں کوما ہوتا ہے تو وہ شخص آرٹ کا شوقین اور موسیقی کا دلدادہ ہوگا اور تمام دنیا میں دوسرے نمبر پر بہترین گانے والا ہوگا اور گا گا کر ہی مر جائے گا۔ (دیکھو بیجو باورا کا ہاتھ فلم بیجو باورا میں)۔

جس شخص کے ہاتھ میں گول چکر ہوں گے وہ ایک تاجر ہوگا۔ وسیع پیمانے پر تجارت کرے گا۔ خربوزوں یا انڈوں کی۔ یا ایسی ہی کسی گول مول چیز کی۔ (دیکھو کسی پھل والے یا مرغی والے کا ہاتھ)۔

اور اگر کسی شخص کے ہاتھ میں ضرب یا کراس کے نشانات ہوں گے تو وہ شخص

ایک ڈاکٹر حکیم یا بہت بڑا عطار یا کمپونڈر ہو گا۔ ضرب اور کراس کا تعلق زیادہ تر ہیں سے ہوتا ہے۔

جس شخص کے ہاتھ میں بے شمار چھوٹی چھوٹی اور سیدھی لکیریں ہوں گی وہ وہ بزنس میں ہو گا خاص کر لکڑی کے شہتیروں کا۔

اور جس شخص کے ہاتھ میں الٹی سیدھی ٹیڑھی لکیریں ہوں وہ یقیناً کسی بڑے افسر کا سٹینو گرافر ہو گا۔ اور تمام عمر سٹینو ہی رہے گا جب تک کہ یہ لکیریں مٹ نہ جائیں یا وہ خود نہ مٹ جائے۔

اور جن ہاتھوں میں تکون کی قسم کے نشانات ہوں گے جیسے مصر کے اہرام ہوتے ہیں تو ایسے ہاتھوں کے مالک یقیناً مصر میں سفیر ہوں گے۔ (مصر جا کر تمام سفیروں کے ہاتھ ملاحظہ فرمائیں)۔

آخر میں عورتوں کے متعلق بھی کچھ بتا دیا جائے۔ عورتوں کا ہاتھ بہت سیدھا اور آسان ہے لیکن جانتا وہی ہے جس کو ان کے ہاتھ لگے ہوں،

عورتوں کے ہاتھ میں صرف دو قسم کی لکیریں ہوتی ہیں۔ ایک تو قدرتی یعنی دل دماغ اور عمر کی اور دوسری بے شمار چھوٹی چھوٹی لکیریں جو خود پیدا کردہ ہوتی ہیں۔

جس عورت کے ہاتھ میں صرف دل دماغ اور عمر کی لکیریں ہوں گی اور دوسری چھوٹی لکیریں بہت کم یا بالکل نہ ہوں گی۔ وہ عورت بہت آسودہ حال اور آرام طلب ہو گی۔ خاوند اس کا مطیع تابعدار اور "حکم کا غلام" ہو گا۔

اور جس عورت کے ہاتھ میں دل دماغ اور عمر کی لکیروں کے علاوہ بے شمار چھوٹی چھوٹی لکیریں ہوں گی وہ عورت اوسط درجہ کی یا غریب طبقہ کی ہو گی۔ وہ حد سے زیادہ کام کاج میں مصروف رہے گی مشقت کی عادی ہو گی اور محنتی ہو گی۔ در حق

کے قریب بچوں کی ماں بننے کا شرف حاصل کرے گی اور اس کی تمام عمر گھر کے برتن مانجھنے میں ہی گزرے گی جس کی بدولت اُس نے یہ بے شمار چھوٹی چھوٹی لکیریں حاصل کی ہیں۔

عورتوں کے ہاتھوں میں دل دماغ اور عمر کی لکیریں بالکل ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اگر لکیروں میں کچھ اختلاف بھی ہو تو اس سے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ یہ لکیریں بالکل ایک جیسی باتیں ظاہر کرتی ہیں مثلاً کنجوسی کی عادت۔ دل کی تنگ، خاوند کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھنے کی عادت۔ کسی نہ کسی طرح پیسہ بچانا اور خاوند سے چھپا کر رکھنا۔ زیور سے محبت، زیور خرید کر دینے والے سے عارضی محبت اور زیور بیچنے والے سے حسد، خود نمائی اور خود فریبی کی عادت، اور جلد دھوکے میں آجانا ان کی خاص صفتیں ہوں گی۔ (دیکھیے اپنی اپنی بیویوں کے نازک ہاتھ)

"خدا بچائے اِن کلرکوں سے"

(تمام سرکاری ہم زلفوں "سے معذرت کے ساتھ)

مس جعفر حسن کہنے لگیں :- " سب لوگ یہی اعتراض کرتے ہیں کہ لڑکیاں دفتروں میں نوکری کیوں کرتی ہیں ؟ آرام سے گھر کیوں نہیں بیٹھتیں ؟ لیکن یہ سوچنے کی تکلیف کوئی گوارا نہیں کرتا کہ وہ کون سے حالات ہیں جن کے تحت مجبور ہو کر لڑکیاں نوکری کی طرف رجوع کرتی ہیں ۔ یہ تو سیدھی سی بات ہے جس کو گھر بیٹھے بٹھائے کھانے کو ملے ۔ ہر طرح کا آرام و آسائش میسر ہو بھلا وہ نوکری کیوں کرنے لگا ۔ لڑکیاں دفتروں میں شوقیہ تو ماری ماری نہیں پھرتیں بلکہ حالات کچھ ایسے ہوتے ہیں جو ان کو ملازمت کے لیے مجبور کرتے ہیں ۔ لوگ تو صرف اتنا ہی سوچ سکتے ہیں کہ یہ لڑکیاں صرف اپنی نمائش کے لیے دفتروں میں جاتی ہیں ۔ اور نمائش بھی کن کے لیے کرتی ہیں ۔ کلرک بہادروں کے لیے ۔ میں نے بھی مجبوری کی حالت میں نوکری کی تھی ۔

جب پہلے دن میرا ایک سیکشن میں تقرر ہوا اور میں نے سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا کر رپورٹ کی تو میں بہت گھبرائی ہوئی تھی ۔ ایک تو یہ ملازمت کا پہلا موقع تھا اور وہ بھی اس جگہ جہاں زیادہ مرد تھے اور مرد بھی ذات کے خاندانی کلرک ۔ تمام دفتر میں کل دو تین لڑکیاں تھیں اور وہ بھی مختلف سیکشنوں میں بکھری ہوئیں ہمارے سیکشن میں کل بارہ کلرک اور تین افسر تھے ۔ ہر ایک اپنی قسم کا آپ ہی تھا ۔

سپرنٹنڈنٹ مسٹر خان محمد ابھی عمر کے بزرگ تھے۔ ڈاڑھی صاف تھی مگر مونچھیں چھوٹی چھوٹی رکھ چھوڑی تھیں۔ ان کے ریٹائر ہونے میں دو ایک سال باقی تھے۔ ان پر عجیب "حال" طاری رہتا تھا۔ ان کا سر اور ہاتھ خود بخود ہلتے رہتے تھے۔ بیٹھے بیٹھے کبھی تو سر کو دائیں سے بائیں جھٹکا دے دیتے۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی بات پر "نہیں نہیں" کہہ رہے ہیں۔ کبھی اُن کا ہاتھ سر کے قریب آ کر ہلنے لگتا تھا۔ اسی طرح جیسے کسی کو اشارہ کر رہے ہوں۔ یہ حرکتیں وہ خود تو نہ کر سکتے تھے بلکہ آٹومیٹک تھیں۔ اکثر ایسا تماشا ہوتا کہ سگریٹ منہ میں نہ رکھ سکتے۔ جب سگریٹ مُنہ کے قریب پہنچاتے تو ہاتھ ہل جاتا۔ سر کسی طرف کو جھٹکا کھا جاتا۔ بڑی کشمکش کے بعد جب سگریٹ منہ میں رکھا جاتا تو اُس کو دیا سلائی لگانی محال ہو جاتی۔ سرکس کا تماشا نظر آ جاتا۔ عمر اور اُن کی حرکات کو نظر انداز کرتے ہوئے دیکھا جائے تو رنگیلے مزاج کے انسان تھے۔ تین شادیاں کی تھیں: روایت ہے کہ اُن کی پہلی بیوی اتھلیٹ تھی۔ ایک دن ایسا بھاگی کہ بھاگتی ہی چلی گئی۔ دوسری بیوی سے یہ خود بھاگ نکلے۔ اور اب اس عمر میں آ کر تیسری شادی کی تھی دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں میں سے پہلے کون بھاگتا ہے۔ دماغ کو تر و تازہ رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ روزانہ مکھن کی پوری ٹکیہ ڈبل روٹی کے دو ٹکڑوں میں رکھ کر نوشِ جان فرماتے تھے۔ اس لیے دماغ میں خشکی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا لیکن افسروں کا خیال تھا کہ دماغ ہے ہی نہیں تو خشکی کہاں پیدا ہو گی۔ لکھنے پڑھنے میں پرانے وقتوں کی رفتار کے قائل تھے۔ وہی "دیر آید درست آید"، لیکن یہاں ہمیشہ "دیر آید" ہی ہوتا تھا "درست آید"، کبھی نہ ہوتے دیکھا۔

ایک اور صاحب مسٹر حنیف اللہ اسسٹنٹ تھے۔ داڑھی مونچھ غائب حد سے زیادہ دراز قد۔ سر سے پاؤں تک ٹانگیں ہی ٹانگیں نظر آتی تھیں۔ لباس بہت

صاف ستھرا رکھتے تھے۔ کسی سینما سے بھی اُن کا تعلق تھا۔ شائد اسی لیے عورتوں سے طبیعت کچھ بھر چکی تھی۔ یہ قدرے نیک خیال اور نیک عقیدہ کے مالک تھے۔ دفتر میں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسی حرکت نہ کرتے تھے، جو دوسرے کلرک کرتے تھے۔

ان کے بعد تیسرے نمبر پر مسٹر بی اے خاں تھے۔ یہ تھے تو صرف میٹرک لیکن نام سے پہلے بی اے تھا، بعد میں نہیں۔ ان کا سر سفید تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دھوپ میں بال سفید کیے ہیں۔ دُبلے پتلے انسان تھے۔ اپنے کام میں ایسے ماہر تھے کہ یا تو کام کرنا آتا ہی نہ تھا یا جان بوجھ کر کر کے نہ دیتے تھے۔ کوئی نہ کوئی بہانہ ضرور کر دیتے مثلاً یہ کہ فائل باہر گئی ہوئی ہے۔ ان کا کام یا تو کوئی دوسرا کر دیتا یا وقت زیادہ گذرنے پر کام کی اہمیت ہی ختم ہو جاتی۔ یہ حضرت بات بات پہ سوال کرنے کے عادی تھے۔ لیکن خود کسی سوال کا جواب نہ دے سکتے تھے۔ اگر کسی فائل کے متعلق پوچھا جاتا کہ مسٹر بی اے خاں فلاں فائل کہاں گئی ہے تو یہ ہمیشہ اُس کلرک کا نام لے کر جو چھٹی پر ہوتا کہتے میں نے فائل اُس کو دے دی تھی وہ اُس کے پاس ہوگی۔" خود بچ نکلتے لیکن تلاش کرنے پر فائل اُن کے ٹرے ہی سے برآمد ہوتی جس کی وجہ یہ بتائی جاتی کہ وہ کلرک اُن کو بتائے بغیر فائل اُن کی ٹرے میں رکھ گیا۔ یہ حکومت کو خوب ملے تھے اور ایک طرح کے وظیفہ خوار تھے۔ چائے اور سگریٹ کے بے حد شوقین تھے۔ دفتر میں ایک چپڑاسی چائے بناتا تھا اور چھ پیسے گلاس کے حساب سے دیتا تھا۔ اس چائے کو دفتر کے لوگ ٹھرّا کہتے تھے مسٹر بی اے خاں اس سے چائے لیتے تھے اور مہمان نوازاتنے تھے کہ گلاس میں سے ایک گھونٹ بھر کر اور گلاس کو اوپر اُٹھا کر ہر ایک سے پوچھتے تھے آپ چائے پئیں گے؟ ایک ہی گلاس سے سب کی تواضع کر جاتے اور خود بھی پی لیتے۔ رنگین مزاج تھے۔ ان کی بھی مجھ پر خاص نظر التفات تھی۔

چوتھے کلرک تھے مسٹر ٹی ڈی بھٹی۔ دُبلے پتلے انسان اور چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔ داڑھی تو کیا تھی داڑھی کا ٹریلر تھا۔ ہمیشہ سوٹ پہن کر دفتر آتے۔ گرمیوں میں ٹائی لگاتے تھے اور سردیوں میں ٹائی استعمال کرتے تھے۔ اس کا راز کسی پہ ظاہر نہ کرتے تھے۔ یہ حضرت بڑی باقاعدگی سے دفتر دیر سے آتے تھے۔ آدھ گھنٹہ دیر سے آنا تو ان کا معمول تھا۔ روزانہ ایک بھرا ہوا غلاف تکیے کا ساتھ لاتے تھے۔ اس غلاف میں اُن کے سرٹیفکیٹ ہوتے تھے۔ جو انہوں نے چپڑاسی سے لے کر افسروں تک سے حاصل کیے تھے۔ ان میں ایک خاص وصف یہ تھا کہ دفتر میں تمام دن کچھ نہ کھاتے تھے۔ پانی کا گھونٹ تک نہ پیتے تھے۔ اِس لیے کبھی کو کھلانے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔ آٹھ سال سے ڈائری اور ڈسپیچ کا کام بڑی "خوش اسلوبی" سے کر رہے تھے۔ بے غرض انسان تھے۔ کوئی کام ہو، کسی کا کام ہو۔ ان سے کہیے کرنے پہ آمادہ ہو جائیں گے اور کر دکھائیں گے۔ کپڑے کی ضرورت ہے ان سے کہیے۔ بازار میں جا کر قطار میں کھڑے ہو جائیں گے۔ دھوپ میں کھڑے رہیں گے۔ دھکے کھائیں گے۔ اپنے کپڑے دھینگا مشتی کی نذر کر آئیں گے مگر آپ کو راشن کا کپڑا ضرور لا دیں گے۔ دوسروں کے لیے دھکے کھانا اُن کی خاص 'ہابی' تھی۔ ویسے بھی بڑے مخلص اور نیک انسان تھے۔

سب سے خطرناک قسم کے کلرک مسٹر رضوی تھے۔ اچھے لمبے تگڑے، ایکٹروں کی طرح مونچھیں۔ یہ حضرت سب سے زیادہ مجھے بھوکی نظروں سے دیکھتے تھے۔ ان سے میں بہت گھبراتی تھی۔

ایک اور کلرک مسٹر اقبال تھے درمیانے قد کے لڑکے سے تھے۔ بہت ہی تیز قسم کے باتونی اور شرارتی۔ مجھ سے رسم و راہ پیدا کرنے کے لیے اُنہوں نے انوکھا طریقہ ایجاد کیا۔ یعنی مجھے باجی کہنا شروع کر دیا۔ بات چیت بھی ہوتی رہے اور کسی کو شک

بھی نہ گذرے ۔ یہ بے غور دار شرارتی ضرور تھے مگر خطرناک نہ تھے ۔

ایک اور مسکین صورت کلرک مسٹر شاہ تھے ۔ نوجوان سے، ہمیشہ سبز گہرے رنگ کی عینک لگائے رکھتے، ایک دن اتفاقاً اُن کی عینک گر گئی تو معلوم ہوا کہ اُن کی ایک آنکھ میں بلب نہیں تب عینک لگائے رکھنے کا راز سمجھ میں آیا ۔ یہ حضرت یتیم قسم کے نظر آتے تھے اور کبھی مجھ سے بات کرنے کی جراَت نہ کرتے تھے اس لیے مجھ کو اکثر اُن پر ترس آتا تھا ۔ باقی جو کلرک تھے اُن کا ذکر ضروری نہیں ۔

پہلے دن جب میں نے سیکشن میں رپورٹ کی تو سپرنٹنڈنٹ مسٹر خان محمد کا سر مجھ کو دیکھ کر بے تحاشا جھٹکے کھانے لگا ۔ کبھی دائیں سے بائیں اور کبھی اوپر سے نیچے ۔ پہلے تو میں ڈر گئی کہ ان کو کیا ہو گیا ۔ پھر جب سر کو ذرا سکون ہوا تو مجھ کو بھی اطمینان ہوا ۔ باقی کلرک صاحبان بھی مجھے دیدے پھاڑ کر دیکھنے لگے ۔ خاص کر مسٹر بی اے خاں اور مسٹر رضوی ۔ ان کے مُنہ اس طرح کھلے ہوئے تھے جیسے گلاب جامنوں کی پلیٹ دیکھ رہے ہوں ۔ سپرنٹنڈنٹ نے ایک دو باتیں کیں اور اُن کا سر پھر گردش میں آگیا میری میز کے لیے جگہ تلاش کی گئی ۔ افسروں کو جب پتہ لگا کہ سیکشن میں ایک لڑکی کا تقرر ہوا ہے تو اُنہوں نے بھی کوشش کی کہ میں اُن کے کمرے میں بیٹھوں ۔ آخر میری میز بڑے کمرے میں دیوار کے ساتھ انگیٹھی کے قریب لگا دی گئی ۔ اور تھوڑے فاصلے پر مسٹر بی اے خاں کی میز تھی ۔ اس قربت کو دیکھ کر شاید اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہے تھے ۔ میں نے دیکھا کہ کلرک ایک دوسرے کو اشارہ بازی بھی کر رہے تھے اور بی اے خاں کے نصیب پر رشک ہو رہا تھا ۔

چند ایک دنوں میں میں نے محسوس کیا کہ سیکشن کافی ترقی کر رہا ہے . . . . سپرنٹنڈنٹ صاحب ہلتے ہوئے سر کے ساتھ سوٹ پہن کر آنے لگے ۔ کبھی کبھی تیز اور سستے قسم کے عطر کی مہک بھی اُٹھتی تھی ۔ آپ اکثر بات بات میں مُسکرا بھی دیتے تھے ۔

اور مجھ پر قابلیت کا رعب ڈالنے کے لیے کلرکوں کے ساتھ بغیر ورب، کے انگریزی بول جاتے۔ مسٹر بی اے خاں کا سر سفید تھا۔ دوسرے دن سُرخ رنگ کا ہوگیا۔ اور تیسرے دن بالکل سیاہ تھا مسٹر رضوی بھی صاف ستھرے ہوکر دفتر آنے لگے جو دو دن ناغہ کر کے شیو کرتے تھے اب روزانہ شیو کرنے لگے۔ ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی بہانے مجھ سے بات کرے۔ خواہ کوئی کام ہو یا نہ ہو۔ کوئی پاس سے گزرتا تو دل پہ ہاتھ رکھ کر نکل جاتا جیسے "ہارٹ ٹربل" ہو۔ کوئی آہستہ سے آہ بھر کر گذرتا جیسے دانت میں تکلیف ہو۔ اور میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اکثر ایک دوسرے کو اشارے بھی ہوتے تھے جو میرے متعلق ہی کچھ بات ہوتی تھی۔ اگر اتفاقیہ میری نظر کسی کلرک کی طرف اُٹھ جاتی تو اسی کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگتے۔ یعنی تم بہت خوش قسمت ہو۔ کبھی کسی کی چاء دفتر میں آتی تو کوئی اُسے اشارہ کرتا جس کا مطلب یہ ہوتا "ابے اس کو بھی چائے کا پوچھ ایک پیالی پیش کر"۔ میں اکثر دیکھتی مگر درگذر کر جاتی۔ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ اکثر گول مول قسم کے فقرے بازی بھی ہوتی تھی۔ فقرے کچھ اس قسم کے ہوتے تھے کہ ان پر گرفت نہ ہو سکتی تھی۔ دو ایک واقعات مجھے یاد ہیں۔

ایک دن میں سبز رنگ کا سوٹ پہن کر آئی مسٹر بی اے خان نے رضوی صاحب کو مخاطب کر کے کہا "ارے یار رضوی چند روپوں کی ضرورت ہے، بندوبست کر دو"!

رضوی صاحب میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "خان تمہیں روپوں کی کیا کمی یار تیرے پاس تو سبزہ ہے"!

ان دنوں سو کا نوٹ سبز رنگ کا ہوتا تھا۔

مسٹر خان آہ بھر کر بولے "ہماری قسمت کہاں کہ کبھی سبزہ ہم کو ملے"!

میں سب سمجھتی تھی مگر کیا کرتی۔

ایک دن بادل آئے ہوئے تھے۔ سردی کافی تھی۔ میں اور مسٹر بی اے خاں انگیٹھی کے قریب تھے۔

مسٹر بی اے خاں چلائے ''رضوی بھائی آج تو بہت سردی ہے۔ ذرا چائے منگواؤ''

رضوی صاحب مسکرا کر بولے'' اب آگ کے قریب بیٹھا ہے اور سردی لگ رہی ہے، قریب ہی شعلہ لپک رہا ہے اور سردی سے مر رہا ہے''

بس ایسی فقرے بازی اکثر ہوتی رہتی تھی۔

وقت گذرتا جا رہا تھا۔ مجھے صرف ٹائپ کا کام دیا گیا تھا۔ افسر بھی موقع کی تاک میں رہتے تھے چھوٹا سا ڈرافٹ ہوا بلا بھیجتے تھے'' مس جعفر حسن ذرا جلدی ٹائپ کر دیجیے'' زیادہ تر پرائیویٹ خطوط ہوتے تھے۔ جو میرے خیال میں مجھ پر رعب گانٹھنے کے لیے ٹائپ کروائے جاتے تھے۔ کسی فرم کو لکھتے آج ڈیڑھ ہزار کا چک بھیج رہا ہوں۔ یا کسی دوست سے تقاضا ہوتا۔ دو سال ہو گئے ابھی تک آپ نے اٹھارہ سو روپیہ واپس نہیں کیا۔ مسٹر ٹی ڈی بھٹی جو افسروں کے چک کیش کرانے جاتے تھے۔ اکثر یہی شکایت کرتے: "چک ڈس آنر" ہو گیا بنک میں اتنا پیسہ ہی نہیں''

میں دفتر کے کام اور ماحول سے مانوس ہوتی جا رہی تھی۔ اور سپرنٹنڈنٹ کا سر پہلے سے زیادہ جھٹکے کھانے لگا تھا۔

ایک صبح دفتر آکر جب میں نے اپنی میز کی دراز کھولی تو سامنے ایک پرچہ ٹائپ کیا ہوا ملا مطلب یہ تھا کہ لکھنے والے کو مجھ سے شدید قسم کا عشق ہو گیا ہے اس کے بچنے کی امید کم ہوتی جا رہی ہے اور اس کے مرض کا علاج صرف میرے پاس

ہے وغیرہ وغیرہ اور آخر میں لکھا تھا کہ وہ حضرت مجھے محبت کا ایک تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں جو مجھے قبول کر لینا چاہیے۔ ورنہ وہ خودکشی کر لیں گے تو پھر میں کیا کروں گی "

ان عاشق زار کو یا تو نسیان کا مرض تھا یا وہ اتنے بہادر تھے کہ پرچے پر اپنا نام ثائپ نہ کیا۔ میں پرچہ پڑھ کر خاموش ہو رہی۔ کبھی مجھے پی اے خان پر شک گزرتا تھا اور کبھی مسٹر رضوی پر اور تھوڑا سا سپرنٹنڈنٹ صاحب پر بھی۔ کسی کے چہرے سے مرنے کے آثار ظاہر نہ ہوتے تھے۔ تمام ہٹے کٹے تھے۔ میں تحفے کا انتظار کرنے لگی۔ دوسرے دن تحفہ مل گیا۔ میز کی دراز کھولی تو تحفہ سامنے حاضر تھا۔ لاحول ولا قوۃ۔ ایک چھوٹا سا خربوزہ سامنے پڑا تھا اور اس پر موٹے قلم سے لکھا تھا۔ "تحفۂ محبت"۔ واہ واہ کیا خوب تحفہ تھا۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ خربوزہ عشق کو کس طریقے سے ظاہر کرتا ہے۔ یا تو خربوزے سے یہ مطلب تھا کہ میری محبت خربوزہ جیسی میٹھی ہے یا ایسی بند اور گتھی ہوئی جیسے بند خربوزہ ہوتا ہے۔ گلاب کے پھول کے متعلق تو سنا تھا کہ محبت کی نشانی ہوتا ہے لیکن خربوزہ کے متعلق کچھ نہ سمجھی کہ کس طرف سے محبت ظاہر کرتا ہے۔ اپنی تو صرف قیاس آرائیاں تھیں اصل مطلب تو وہ حضرت خود جانتے ہوں گے۔ اس کے بعد تحفوں کا سلسلہ اچھا شروع ہوا۔ روز کچھ نہ کچھ میز کی دراز میں سے نکل آتا۔ یا تو یہ صاحب چھٹی کے بعد جب سب چلے جاتے تھے تحفہ میز کی دراز میں رکھ جاتے تھے ——— ——— یا صبح سب سے پہلے دفتر آ کر یہ کار خیر انجام دیتے تھے لیکن یہاں تو آم کھانے شروع کر دیئے تھے۔ پیڑ گننے کا خیال چھوڑ دیا تھا۔ دن بدن تحفوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ریشمی رومال، سینٹ اور عطر کی شیشیاں۔ صابن کی ٹکیاں۔ چاکلیٹ ٹافی اور زیورات (صرف رولڈ گولڈ کے) خوب جمع ہونے شروع

ہو گئے تھے مجھے تین آدمیوں پر شک تھا مسٹر رضوی ہسٹری اے خاں یا سپرنٹنڈنٹ صاحب ہی ایسی حرکت کر سکتے تھے۔ مسٹر حنیف۔ اللہ کے متعلق بالکل خیال نہ تھا مسٹر اقبال اس قسم کا لڑکا نظر نہ آتا تھا بلکہ وہ تو اُلٹا مجھ ہی سے کچھ نہ کچھ لے جاتا تھا۔ مسکین صورت بنا کر کہتا "باجی آپ کے پاس دو روپیہ ہوں گے عنایت کیجیے۔ پہلی تاریخ کو واپس کر دوں گا"

لیکن یہ نہ بتاتا تھا کہ کس ماہ کی پہلی تاریخ کو کیونکہ پہلی کبھی آتی ہی نہ تھی۔ گئے مسٹر بھٹی۔ یہ بے چارے نیک نفس آدمی تھے سٹیشنری کے انچارج۔ بس اتنی مہربانی کرتے تھے۔ کاربن پیپر اگر ایک مانگا تو انہوں نے دو عنایت کر دیئے مسٹر شاہ جن کی ایک آنکھ میں بلب نہ تھا وہ تو مجھ سے سہمے رہتے تھے ان کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

ایک دن گھر جانے سے پہلے میں نے ایک پرچہ پہ "صرف دس روپیہ" لکھ کر میز کی دراز میں رکھ دیا کہ دیکھیں اس کا کیا اثر ہوتا ہے اور کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ دوسری صبح ایک ٹائپ شدہ پرچہ اور ایک ایک روپیہ کے دو نوٹ رکھے ہوئے ملے پرچہ پر لکھا "دس روپیہ ضرور حاضر کر دیتا۔ لیکن کیا کروں مہینہ کے آخری دن ہیں اس لیے دو روپے حاضر ہیں اور یہ بھی ایک دوست سے ادھار لیے ہیں جس کی حالت خود پتلی ہے پہلی تاریخ کو باقی کے آٹھ روپیہ بھی حاضر کر دوں گا۔ انشاءاللہ"

غرض دو تاریخ کو پورے آٹھ روپے بھی مل گئے۔ یہ سلسلہ کافی عرصہ تک جاری رہا۔ مگر اس غائبانہ عاشق زار کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ اگر ہو جاتا تو میں اس کا غائبانہ نماز جنازہ ہی پڑھ دیتی۔

سال بھر ملازمت کی تھی کہ گھر کے حالات خوش گوار ہو گئے اور کسی اور وجہ سے مجھے نوکری سے استعفا دینا پڑا۔

دفتر میں میرا آخری دن تھا۔ وقت بہت اچھا گذرا تھا۔ نوکری چھوڑنے کا
افسوس نہ تھا لیکن دل میں یہ حسرت ضرور تھی کہ تحفہ دینے والے "حاتم طائی" کا نام
معلوم ہو جائے۔ سیکشن والے چندہ اکٹھا کر کے الوداعی پارٹی دے رہے تھے۔
اُن کے چہروں میں کچھ نمایاں فرق پڑ گیا تھا جیسے کسی چیز کے کھوئے جانے کا
افسوس ہو۔ اتنے میں مسٹر شاہ جن کی ایک آنکھ میں بلیب نہ تھا ایک کاغذ میز
پر پھینک کر بھاگتے ہوئے بولے۔

"ذرا اس کو ٹائپ کر دیجیے!"

یہ کاغذ پہلے ہی ٹائپ شدہ تھا۔ میں نے پڑھا تو لکھا تھا "آپ تو جا رہی ہیں
اب میں تحفے کس کو پیش کروں گا!"

لیجیے اچانک حسرت نکل گئی۔ نام معلوم ہونے کی خوشی بھی ہوئی اور دل کو
دھکا بھی لگا کہ عاشق زار راجہ رنجیت سنگھ کے شاہی خاندان سے نکلے مسٹر شاہ
کے متعلق مجھے گمان تک نہ تھا۔ ان کی حالت اور اپنی قسمت پر افسوس ہوا"

مس جعفر حسن ہنس کر کہنے لگیں یہ ہیں میری دفتر کی مختصر زندگی کے حالات
اور مزے کی بات سنیے۔ چند دن بعد مجھے دفتر جانے کا اتفاق ہوا تو کیا دیکھتی
ہوں کہ وہ رونق ہی نہیں۔ کسی کی داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔ رضوی صاحب کی پتلون
کی کریز غائب ہے۔ مسٹر بی اے خاں کا سر پھر برف کی طرح سفید ہے۔ بس وہی
پُرانا دور شروع ہو گیا تھا۔ جو میری ملازمت سے پہلے تھا۔ یہ سب فیشن اور
میک اپ بس میرے لیے ہوتا تھا۔ ان کا اپنا حال خستہ ہی رہتا تھا۔

خدا بچائے ان کلرکوں سے!!

ایسا کیوں ہوتا ہے

ایسا ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے لیکن آج تک لوگ یہ نہ سمجھ سکے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیونکہ روزمرہ زندگی میں ایسا آپ کے ساتھ بھی ضرور ہوتا ہے، اِس لیے آج آپ ہی بتائیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے جس کی وجہ سے اکثر اوقات انسان جھنجھلا اٹھتا ہے اُسے غصہ آجاتا ہے اور کبھی کبھی خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے۔

برسات کا موسم ہے اور رات کا وقت۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے آپ صحن میں بڑے مزے سے سو رہے ہیں۔ اچانک بوندیں پڑنے لگیں۔ مزے کی نیند سے آنکھ کھل گئی۔ غنودگی طاری ہے۔ اُٹھنے کے سوا چارہ نہیں خود اُٹھ کر بستر گول کیا۔ یہ سوچ کر کہ اس وقت ملازم کو کون بلائے اور ملازم بھی کس کس کا بستر اُٹھائے گا بستر کندھے پر رکھا اور چارپائی بغل میں دبا کمرے کی طرف بھاگے، دیکھیے وہ ہو گیا۔ وہ یہ کہ چارپائی کا پچھلا پایہ کمرے کے دروازے کے ساتھ زور سے ٹکرایا۔ ایک جھٹکا سا لگا اور چارپائی رُک گئی۔ اب یہ بتائیے ایسا کیوں ہوا طبیعت میں غصہ کیوں آیا اور دل نے یہ کیوں چاہا کہ اس کمبخت پچھلے پائے کو اتنے زور کے ساتھ دروازے کے ساتھ مارا جائے کہ ٹوٹ جائے۔ خیر کمرے میں آئے چارپائی بچھائی بستر کھولا اور لیٹ گئے۔ لیٹے لیٹے احساس ہوتا ہے کہ بوندیں باہر بند ہو گئیں۔ کمرے میں حبس ہے اس لیے پھر بوریا بستر سمیٹا اور باہر بھاگے بستر بچھایا اور لیٹ گئے۔ لیجیے پھر وہ ہو گیا۔ آپ کے لیٹتے ہی بوندیں پھر گرنے لگیں۔ طبیعت میں پھر غصہ آیا مُنہ اُٹھا کر

اللہ تعالیٰ کو غور سے دیکھنے کی کوشش کی کہ یہ کیا ادا ہے۔ غرضیکہ آپ تین چار مرتبہ اندر باہر بوریا بستر سمیت بھاگنے کی مشق کرتے ہیں۔ آپ اندر آتے ہیں تو بارش بند ہو جاتی ہے باہر جاتے ہیں تو پھر شروع ہو جاتی ہے اور پھر بار بار کمبخت یا یہ بھی تنگ کرتا ہے۔ اب بتائیے نا ایسا کیوں ہوتا ہے۔

اور لیجیے آپ بازار میں شاپنگ کر رہے ہیں۔ یا مہینے کی آخری تاریخیں ہیں اور پیسہ پاس نہیں۔ آپ مفت میں ہی گھوم رہے ہیں۔ کافی وقت گزر گیا ہے آپ محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت آپ کو لیٹرین میں "چھوٹا حاضری" کی ضرورت ہے آپ اس حاجت کو دباتے ہیں کہ گھر چل کر فارغ ہوں گے۔ آپ تیزی سے گھر کی طرف روانہ ہوتے ہیں، لیجیے پھر دہ ہو گیا۔ ایسے خطرناک وقت میں کوئی نہ کوئی دوست آ ٹکرایا اور راستہ روک کر کھڑا ہو گیا سخت غصہ آیا، کبھی ایک ٹانگ ذرا اوپر کی کبھی دوسری بڑی مشکل سے جان چھڑا کر بھاگے لیٹرین میں جا کر اطمینان کا سانس لیا جلدی میں اب پھر دہ ہو گیا۔ یعنی ازار بند میں گانٹھ پڑ گئی طبیعت جھلا اٹھی دل نے چاہا اس کمبخت، ازار بند کو کچا ہی چبا جائیں۔

اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کبھی "بڑا حاضری" کے لیے لیٹرین جانا پڑے تو کوئی بزرگ پہلے ہی وہاں موجود ہیں اور جب تک تمام سگریٹ ختم نہ فرمالیں "حاضری" ادا نہیں کر سکتے۔ آپ باہر بے قرار ہیں کہ کب باہر آئیں اور آپ جائیں اور آپ ایسا محسوس کرتے ہیں کہ وہ حضرت اندر ہی سو گئے ہیں۔

آپ ایک دعوت میں مدعو ہیں جہاں سب انتظام فرشی کیا گیا ہے۔ آپ اخلاقاً جوتا اتار کر فرش پر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس وقت آپ کے پاؤں بھی جرابوں سے بے نیاز ہیں۔ جب آپ پلاؤ سے دو دو ہاتھ کر کے رخصت ہونے لگتے ہیں اور جوتے پہن لیتے ہیں تو پھر وہی ہو جاتا ہے یعنی کسی نہ کسی طرح دو تین چاولوں کے دانے

جمتے میں تشریف لے آتے ہیں اور پاؤں کے نیچے لئی کی طرح محسوس ہونے لگتے ہیں۔ طبیعت جھنجھلا اُٹھتی ہے۔

کسی بڑے آدمی نے آپ کو خوش قسمتی سے ملاقات کا وقت دیا ہے۔ اس لیے آپ وقت پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ آپ کے پاس کار نہیں اگر ہوتی تو آپ بھی بڑے آدمی ہوتے پھر کوئی چھوٹا آدمی آپ سے ملنے آتا۔ اس لیے آپ سائیکل لے کر نکلتے ہیں۔ وقت کم ہے۔ آپ سائیکل تیز چلانا شروع کر دیتے ہیں آپ چاہتے ہیں کہ وقت پر پہنچ جائیں۔ ایسے موقع پر وہ بات ہو جاتی ہے جو پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ یا تو کسی رستے پر ٹریفک کا سپاہی روک لیتا ہے یا تیزی میں سائیکل کی چین اتر جاتی ہے۔ چڑھانے کے باوجود ہر بار اُتر تی ہے۔ اس وقت دل چاہتا ہے کہ سائیکل کو اُٹھا کر دیوار پر دے مارا جائے۔ یا نیکی سمجھ کر دریا میں ڈال ہمیشہ کے لیے بھلا دیا جائے۔

کسی دن سینما یا پک نک کا پروگرام بن گیا ہے بیگم صاحبہ معمول کے مطابق دو تین گھنٹے میں تیار ہوئیں۔ آپ باہر جانے کے لیے بالکل تیار ہیں جو بات کبھی نہ ہوئی تھی آج ہو جاتی ہے۔ یعنی عین وقت پر اچانک ہی مہمان آ ٹپکتے ہیں اور آپ کا سارا پروگرام خاک میں ملا کر رکھ دیتے ہیں۔ آپ جانا بھی چاہتے ہیں مگر مہمان کی وجہ سے جا بھی نہیں سکتے۔ اس وقت دل یہی چاہتا ہے کہ کاش خودکشی اسلام میں جائز ہوتی۔

یہ تو آپ نے بارہا دیکھا ہو گا کہ جب کبھی رات کو آپ گھر دیر سے آئے تو بیگم صاحبہ سے بہانہ کر دیا۔ کہ فلاں دوست کے گھر تھا۔ وہ آنے نہ دیتے تھے بس پھر بیگم صاحبہ آپ کو تو چھوڑ دیں گی مگر آپ کے اس دوست کو ہلکی پھلکی باتیں سنانا شروع کر دیں گی کیونکہ اُن کے خیال میں ان کے معصوم میاں کو یہ دوست لوگ خراب

کرتے ہیں۔

آج تک یہ نہ سمجھ میں آیا کہ جب کسی محفل میں ایک شخص جمائی لیتا ہے تو محفل کے تمام افراد باری باری کیوں مُنہ کھولنا شروع کر دیتے ہیں۔ یا عید کی نماز میں ایک شخص کھانستا ہے تو پھر چاروں طرف کھانسی کا طوفان کیوں اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

ایک بات یہ بھی معلوم نہ ہو سکی کہ جب کبھی باداموں کا شوق فرمایا جائے تو آخری بادام ہمیشہ ہی کیوں کڑوا نکلتا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آخری بادام سب سے پہلے کھا لیا جائے۔

دفتر میں صبح سے شام تک بحیثیت افسر یا ماتحت دستخط کرتے وقت جب تاریخ لکھی جاتی ہے تو ہر بار ہاتھ کیوں رُک جاتا ہے۔ تاریخ کا آپ کو بھی علم ہے اور کئی بار لکھ بھی چکے ہیں۔ مگر ہر بار ہاتھ رُکتا ہے۔ اور سوچنا پڑتا ہے کہ آج کیا تاریخ ہے۔

یہ کیا بات ہے کہ جب کبھی آپ کو ہسپتال جانے کا اتفاق ہو تو آپ محسوس کرتے ہیں کہ تمام شہر کے لوگ بیمار ہیں اور تندرست کوئی نہیں اور جب کبھی آپ ریلوے سٹیشن پہ جائیں تو آپ کو ایسا دکھائی دے گا کہ لوگوں کو سوائے سفر کرنے کے اور کوئی کام نہیں۔

کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ اگر کسی محترمہ سے اُس کی عمر پوچھی جائے تو وہ فٹا کیوں مان جاتی ہے۔ اور پھر اُس کی عمر ۲۱ سال پہ آ کر رُک کیوں جاتی ہے۔ ایک محترمہ نے عدالت میں اپنی عمر ۲۱ سال اور چند ماہ بتائی تھی۔ جب عدالت نے سوال کیا کتنے ماہ؟ تو فرمانے لگیں ایک سو آٹھ۔

اب ذرا اپنی مجبوری پر بھی غور فرمائیے۔ آپ جس شخص سے مصروفِ گفتگو ہیں وہ بدقسمتی سے بے تحاشہ ہکلاتا ہے بعض اوقات تو اس طریقہ سے ہکلاتا ہے کہ

آپ ہنسنا چاہتے ہیں مگر لحاظ کی وجہ سے ہنس نہیں سکتے - یہ کیسا رونے کا مقام ہے۔

اب یہ بتائیے کہ اس میں کیا راز ہے کہ بھولی ہوئی بات یا کوئی چیز نماز یا ایبادت میں کیوں یاد آتی ہے۔

فرض کیجیے آپ تنگدست ہو جاتے ہیں اور آپ کسی سے قرضہ مانگنے کے عادی نہیں۔ مجبوراً حوصلہ کر کے آپ ایک دوست سے قرضہ مانگنے کے لیے جاتے ہیں لیکن جب آپ دوست سے ملتے ہیں تو قرضہ مانگنے کے بجائے ادھر ادھر کی باتیں کر کے واپس آجاتے ہیں۔ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔

بتائیے کیا یہ حقیقت نہیں کہ جس ہاتھ پر چوٹ لگی ہوتی ہے وہی بار بار دیوار یا دروازے سے کیوں ٹکراتا ہے۔

جب آپ اپنی کار میں (اگر اللہ تعالیٰ نے عنایت کی ہے یا کسی دوست کی کار میں بیٹھے جا رہے ہوں تو آپ کو پیدل چلنے والوں پر غصّہ آتا ہے کہ سامنے سے ہٹتے کیوں نہیں بلا وجہ سڑک کیوں کراس کرتے ہیں۔ راستہ کیوں روکتے ہیں اور جب آپ پیدل جا رہے ہوں تو آپ کو کار والوں پر غصّہ آتا ہے۔ کتنے بد دماغ ہیں کتنی تیز چلاتے ہیں اور اوپر ہی چڑھانے جا رہے ہیں۔ اور پھر گرد کتنی اُڑاتے ہیں۔ آئیے اب ہم یہ سوچیں کہ ایسا کیوں ہوتا ہے اور کب تک ہوتا رہے گا۔

کلرک کی وصیّت

میں ایک لوئر ڈویژن کلرک ہوں۔ جہاں تک روایت پہنچتی ہے کلرکی میرا خاندانی پیشہ ہے۔ اس لیے میں خاندانی کلرک ہوں۔ مجھے فخر ہے کہ میں کلرک قوم سے تعلق رکھتا ہوں۔ اور میں ذات کا کلرک ہوں۔ اتنی صفات کے باوجود میں خود کشی پر مجبور ہوں۔ مجھے آج کل کے نوجوانوں کی طرح مس جعفر حسن سے محبت ہے۔ مس جعفر حسن ہمارے سیکشن میں ٹائپسٹ ہے۔ دو سال تک متواتر ہر ماہ آدھی سے زیادہ تنخواہ میں اُس کے لیے تحفے خریدنے اور اُس کی ناز برداری کرنے میں صرف کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ میں مقروض ہو گیا ہوں۔ مجھے قرض خواہ بھی تنگ کرتے ہیں اور مس جعفر حسن نے بھی میرا دل توڑ دیا ہے۔ اب وہ مجھے چھوڑ کر افسر پر ملتفت ہے۔ سنا ہے کہ آئندہ ماہ اُن کی شادی ہو رہی ہے۔ میں اس کمبخت کی برات اپنی زندگی میں نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے میں خودکشی پر مجبور ہوں اور خودکشی سے پہلے وصیت لکھ رہا ہوں۔ اور ملتجی ہوں کہ جس کسی شریف النسان کے ہاتھ میری یہ وصیت آئے اس پر ضرور عمل کرے تاکہ ثواب دارین حاصل ہو۔ اگر خدانخواستہ ایس آئی کے ہاتھ میری یہ وصیت آئے تو اُس سے عرض کرتا ہوں کہ کم از کم چالیس فی صدی میری وصیت پر عمل کرے۔

میری خود داری از جاں نثاری کے بعد میرے ٹرنک کو میری چارپائی کے نیچے سے نکالا جائے۔ یہ ٹرنک بہت متبرک ہے۔ میرے دادا کے ابا جان جب کلرک

تھے وہ اِسے استعمال کرتے تھے ۔ اس ٹرنک کی چابی میرے بستر کے تکیے کے نیچے ہے ۔ میرے ٹرنک میں تھوڑی سی چیزیں ہیں ان کو ٹھکانے لگانے کی تدبیر اس طرح کی جائے ۔ ایک سفید پتلون جو سیٹ پر سے تھوڑی سی پھٹی ہوئی ہے اور نیلے رنگ کا گرم کوٹ جس کی پھٹی باہوں میں سے کہنیاں باہر جلوہ گر ہو جاتی ہیں یہ دونوں چیزیں میرے کالج کے وقتوں کی یادگار ہیں میرے دفتر کے چپڑاسی نور خاں کو دے دی جائیں ۔ میں نے اس سے صرف چھ ماہ ہوئے کل پانچ روپے ادھار لیے تھے جو آج تک ادا نہ کر سکا ۔

میرا خاکی اونی مفلر اور گرم جراب کا سفید جوڑا جو ایڑیوں سے محروم ہے میں نے لنڈا بازار سے خریدا تھا وہ دفتر کے جمعدار امام دین کو دے دیا جائے ۔ امام دین نے پچھلی سردیوں میں ایک بوری سرکاری کوئلہ چرا کر میرے گھر پہنچایا تھا ۔

ایک عدد پرانی ٹارچ جس کے سیل خریدنے کی مجھے توفیق نہ ہوئی اور ایک عدد گھسی ہوئی پرانی تاش اور دو جاپانی ٹائیاں دفتری منّاں کو دے دی جائیں ۔ یہ بے چارہ مجھے گھر کے لیے سرکاری موم بتیاں ۔ ماچس اور کاغذ پنسل وغیرہ دیتا رہا ہے ۔

ٹرنک میں ایک انگریزی کتاب بھی ہے جس کے شروع اور آخر کے صفحے غائب ہیں ۔ یہ کتاب مجھے مسٹر جیکب نے پڑھنے کے لیے دی تھی کیونکہ یہ صفحے غائب ہونے کی وجہ سے بازار میں بک نہ سکی ۔ اِس لیے شکریہ کے ساتھ مسٹر جیکب کو واپس کر دی جائے ۔

تین قمیص اور دو پاجامے جو کہیں نہ کہیں سے مرمت طلب ضرور ہیں دھوبی کو بطور تحفہ دے دیے جائیں ۔ اس کی دھلائی کے پیسے گذشتہ تین ماہ سے میرے ذمہ ہیں ۔

ٹرنک میں سب سے نیچے جناب کویراج ہرنام داس عرف بی اے کی کتاب "ہدایت نامہ بیوی" بھی ہے، یہ کتاب میں نے قاضی حفیظ صاحب سے پڑھنے کے لیے لی تھی - یہ کتاب بے تصویر ہے - اس کی تمام تصویریں قاضی صاحب نے نکال لی ہیں اس کتاب کو میں نے پڑھا بھی نہیں - میرا ارادہ قاضی صاحب کو واپس کرنے کا نہ تھا - میں نے سوچا تھا کہ شادی کے بعد مس جعفر حسن کو بطور تحفہ پیش کروں گا - چونکہ یہ رنگین خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا - اس لیے یہ کتاب ایمانداری کے ساتھ قاضی صاحب کو واپس کردی جائے - ان کے کام کی چیز ہے -

ایک جاپانی ریشمی رومال میں لپٹے ہوئے مس جعفر حسن کے چند خطوط جو زیادہ تر مجھ سے پیسہ اور تحفہ مانگنے کے متعلق ہیں اور ایک تصویر بھی ہے - یہ بیش قیمت خزانہ جو انکم ٹیکس سے مبرا ہے میرے ساتھ ہی دفن کر دیا جائے -

جب ٹرنک خالی ہو جائے تو مالک مکان کو بالکل مفت دے دیا جائے -

اس مہربان کا دو ماہ کا کرایہ میرے ذمہ ہے - مگر اس کا مجھے چنداں افسوس نہیں - یہ مکان کون سا اس کی ملکیت ہے - اس نے بھی الاٹ ہی کرایا تھا -

اس کے بعد میرا نفیس بستر جس میں پرانی دری - پرانا کھیس - بوسیدہ کمبل پھٹی ہوئی چادر اور میلا تکیہ ہے، یہ سب گلی کے موڑ پر جو دودھ والا ہے اس کو دے دیا جائے اس کمبخت کا کافی قرضہ میرے ذمہ ہے -

میری چارپائی کرایہ کی ہے یہ دکاندار کو واپس نہ کی جائے - کیونکہ جو بھی واپس کرنے جائے گا دکاندار اس سے سات ماہ کا کرایہ وصول کرے گا - میں کسی کو دھوکا دینا نہیں چاہتا - اس لیے میری تمنا ہے کہ یہ چارپائی جمعدارنی کو دی جائے، وہ کہتی تھی بابو جی یہ بہت بڑھیا کھاٹ ہے!" اس کے ساتھ ہی کالی ٹوٹی ہوئی کنگھی اور زلف بنگال کی آدھی شیشی بھی اسے ہی دے دی جائے تاکہ وہ بھی یاد رکھے

کہ کسی خاندانی کلرک سے واسطہ پڑا تھا۔

میرا کالا بوٹ جو چارپائی کے نیچے پڑا ہے ایک ماہ تک تو مسکراتا رہا اور اب کھلکھلانے لگا ہے جس کو بھی فِٹ آئے لے لے۔

میری المونیم کی دیگچی جو میں نے مجبوراً چار پکانے کے لیے خریدی تھی میرے ہمسائے کی تیسری لڑکی کو دی جائے۔ یہ میری آخری خواہش ہے اور اس کا ڈھکنا چلو یہ بھی اسے ہی بخش دیا جائے وہ بھی یاد رکھے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

میرے کمرے میں جو بلب ہے وہ سرکاری ہے اور شیڈ مالک مکان کا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ایس آئی صاحب قبول فرمائیں۔

کمرے کی الماری میں ایک آدھ ڈبیا سگریٹ کی ہے جو گرمارکہ۔ یہ سگریٹ سنتری بادشاہ آپس میں بانٹ لیں۔

میرے پاس روپیہ پیسہ افیون کھانے کو بھی نہیں۔ آج چار تاریخ ہے اور تنخواہ ملنے میں چھبیس دن ہیں۔ میں نے ہر چیز حق دار کو بانٹ دی ہے صرف اب جانداد خاں پٹھان رہ گیا ہے۔ جس سے میں نے مدت ہوئی پچاس روپے مسٹر جعفر حسن سے قرض لیے تھے۔ اس کا سود وہ مجھ سے رقم سے چار گنا زیادہ وصول کر چکا ہے مگر پچاس روپے ابھی تک وہیں لگے ہوئے ہیں۔ اس کو تسلّی دی کہ صبر کرے۔ اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کو ستر گنا زیادہ رقم دے گا اور مجھے ستر گنا زیادہ سود۔

مجھے امید تو نہیں پھر بھی اگر کوئی چیز میرے کمرے سے نکل آئے تو وہ جس میں ہمت ہو لے جائے لیکن لڑائی جھگڑا نہ ہو اس سے میری بدنامی ہوگی۔

میری آخری خواہش یہ ہے کہ مجھے کفن کو تو ریلز کے لٹھے کا نہ دیا جائے اس

میں مایا زیادہ ہوتی ہے اور سوت کم۔ مجھے قبر میں تکلیف ہو گی۔ مجھے جاپانی کا لٹھا پسند ہے۔ جو آج کل نایاب ہے۔

تمام کلرکوں کو میرا سلام پہنچائیں اور اُن کو تاکید کر دیں کہ میری یاد میں جلسے مت کریں۔ ہاں وومنٹ کے لیے پن ڈاؤن سٹرائیک کر لیں۔ افسر کو بھی کہہ دیں کہ مس جعفر حسن سے بچ کے رہے۔ کہیں اسے بھی غچا نہ دے جائے اب میں خوشی سے جان دے سکتا ہوں۔

لیکن میں خود کشی کیسے کر سکتا ہوں۔ مجھے یاد آگیا کہ اگر خود کشی کامیاب ہو جائے تو بعد میں پوسٹ مارٹم ہوتا ہے اور اگر ناکام رہے تو گورنمنٹ مقدمہ چلا دیتی ہے۔ میں پوسٹ مارٹم کسی صورت میں گوارا نہیں کر سکتا۔ میں نے تو کبھی زندگی میں انجکشن نہیں لگوایا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مرنے کے بعد میرے جسم کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا جائے۔ اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اگر خدانخواستہ میں بچ جاؤں تو پھر مجھ پر کیس چل پڑے۔ اور میں تمام عمر عدالتوں میں دھکے کھاتا پھروں۔ اس لیے میری وصیت کو فی الحال منسوخ سمجھا جائے۔

جہاں ہم کھیلتے ہیں

میں شہر کی ایک بڑی کلب کا ممبر ہوں۔ اس کلب کا ممبر بننا بہت مشکل ہے ممبر بننے کی بعض درخواستوں کو کوئی وجہ بتائے بغیر نامنظور کر دیا جاتا ہے۔ بعض پر حکم صادر ہوتا ہے، تین ماہ بعد پیش ہوں۔ کلب کے قوانین روائتی محبوب کے دل کی طرح سخت ہیں۔ مجلس عاملہ کیا کر سکتی ہے۔ ایک صاحب اس لیے ممبر نہ بن سکے کہ اُنھوں نے اپنی عرضی پر اُردو میں دستخط کر دیے تھے۔ ملک میں ہر طرف شور ہو رہا ہے۔ اُردو پڑھیے، اُردو لکھیے، اُردو بولیے اور اُردو سنیے۔ لیکن کلب کے قانون کے مطابق ایسا شور کلب میں داخل نہیں ہو سکتا۔

کلب میں تمام قسم کے کھیل کھلائے جاتے ہیں۔ ٹینس، بیڈمنٹن ٹیبل ٹینس۔ برج۔ رمی۔ کیرم، شطرنج وغیرہ وغیرہ بھی۔ پڑھنے کے لیے اخبار اور رسالے بھی ہیں۔ جب آپ اُکتا جائیں تو بخوشی گھر جا سکتے ہیں۔

اِس کلب میں ہر پیشے کے ممبروں کی آمدورفت ہے، تاجر، ڈاکٹر، انجینیر، وکیل، بڑے بڑے افسر، چھوٹے چھوٹے افسر، موٹے موٹے افسر۔ اور دفتروں کے کلرک۔ یہاں ہر موضوع پر زور شور سے گفتگو ہوتی ہے بعض اوقات ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ملک کی قسمت کا فیصلہ اس کلب کے ممبروں کے ہاتھ میں ہے اور حکومت کے نام ہدایات یہیں سے جاری ہوتی ہیں۔ اس کلب کے بعض ممبر غیر معمولی طور پر دل چسپ ہیں۔ ان میں سے بعض ارکان کا اصرار ہے کہ میں اُن کا

آپ سے تعارف کراؤں ۔ انہی ارکان میں میرے دوست مولانا فیض الاسلام ہیں اُن کا کہنا ہے کہ کیا ہم اس قابل بھی نہیں کہ ہمارا کسی سے تعارف کرایا جائے۔ کیا تم انیس کا شعر بھول گئے ہو ۔

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

چنانچہ اس شعر کے پیش نظر اپنے احباب کا آپ سے تعارف کرانا میرے لیے ناگزیر ہے ۔

سب سے پہلے ان صاحب سے ملیے ۔ عمر پچاس سال ۔ رنگ سُرخ سفید چہرہ داڑھی مونچھ سے بے نیاز ۔ سُوٹ بوٹ میں ملبوس ۔ آپ ہیں میاں افضل کریم بہت بڑے تاجر ہیں ۔ آپ صلح کل صلح جو اور صلح پسند انسان ہیں ۔ بالفاظ دیگر آپ کلب کے مہاتما گاندھی ہیں ۔ قابل تعظیم ہستی ہیں ۔ ہر معاملے یا جھگڑے کا صلح صفائی سے خاتمہ کر دیتے ہیں ۔ آپ امریکہ کے صدر کی طرح پورے پانچ سال کلب کے صدر رہے ۔ جن دنوں آپ کلب کے "آنرن ہاور" تھے ایک ممبر نے دوسرے ممبر کے رویہ کے خلاف آپ کی خدمت میں ایک درخواست گذاری ۔ معاملہ کو رفع دفع کرنے کے لیے دس بارہ دن آپ درخواست کو ہی گول کر گئے ۔

ایک دن درخواست دہندہ نے پوچھ لیا "میاں صاحب میری درخواست کا کیا بنا" آپ نے فرمایا "برخوردار کون سی درخواست ! اچھا اچھا وہ جو نیلے سے کاغذ پر ٹائپ کر کے دی تھی ، بھائی وہ عجلت میں پڑھ نہ سکا ۔ اصل میں وہ دھوبی کے ہاں چلی گئی ۔ اب تم پوچھو گے برخوردار کہ دھوبی کے پاس کیسے چلی گئی ۔ تو بھائی بات یہ ہے کہ جس قمیص کی جیب میں تمہاری درخواست تھی ۔ وہ دھوبی کے ہاں چلی گئی ۔ اب دیکھو آدلی تو قمیص ابھی تک واپس نہیں آئی ۔ اگر واپس آ

بھی گئی تو کیا ضروری ہے کہ اس جیب میں درخواست بھی ہو۔ اور اگر درخواست نکل بھی آئی تو کیا معلوم پڑھی بھی جاسکے گی یا نہیں۔ کیونکہ دھل دھلاکر بالکل صاف ہوچکی ہوگی۔ برخوردار یہ دھوبی کی بھٹی بھی کیا چیز ہے۔ میل کو کس طرح صاف کرتی ہے تو پھر کیوں نہ برخوردار ہم اپنے دلوں کو اس درخواست کی طرح صاف کرلیں جو کبھی دھوبی سے دھل کر آئے گی اور اس تنازعہ کو رفع دفع کردیں۔"

یہ جیسے میاں صاحب نے فیصلہ کردیا، اب اتنے بڑے فیصلہ پر انکار کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے۔ آپ کو غصہ بہت کم آتا ہے۔ پانچ چھ سال کے بعد اور وہ بھی زلزلہ کی طرح چند سیکنڈ کے لیے۔ فروٹ کے بے حد شوقین ہیں سکردو اور گلگت سے اکثر سیب منگواتے ہیں۔ یار لوگوں کا کہنا ہے کہ آپ مسمی گل محمد کی طرح اپنے اصول سے کبھی ادھر ادھر نہیں ہٹتے۔

وہ دیکھیے سامنے چھوٹی سی داڑھی والے دراز قد حضرت اچکن پہنے تشریف لارہے ہیں۔ ان کا نام گرامی ہے چوہدری رفیق۔ آپ سرکاری افسر ہیں۔ یار لوگ اکثر ان کو سرکار یعنی گورنمنٹ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ چھوٹی سی داڑھی کی شان نزول کیا ہے۔ یہ کہانی ان کی زبانی سنیے۔ فرماتے ہیں۔۔۔
کسی زمانے میں نماز کا سختی سے پابند تھا۔ ایک چپڑاسی نے کہا "صاحب آپ بہت اور پکے نمازی ہیں۔ اگر آپ داڑھی بھی چھوڑلیں یعنی رکھ لو تو کیا ہی بات ہو"
بس یہ بات دل کو لگی۔ دل نے کہا ایک بات اس کی مان اور ایک میری مان۔
بس اسی دن سے میں نے داڑھی رکھ لی اور نماز چھوڑ دی"

مسجدیں بنوانا ان کا خاص مشغلہ ہے۔ جہاں بھی تھوڑی سی جگہ خالی دیکھیں گے مسجد بنانے کی طرح رکھ دیں گے۔ ہسپتال، سکول، عدالت، کلب غرضیکہ جہاں بھی تھوڑی سی جگہ نظر آئے گی صفیں بچھوا کر مسجد بنوا دیں گے۔ آپ کے مزاج میں

انتہائی انکسار ہے مسجد بنوا کر خود مسجد کے قریب تک نہ جائیں گے کہ کہیں لوگوں کو معلوم نہ ہو جائے کہ یہ مسجد اُنھوں نے بنوائی ہے۔ آپ کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دفعہ آپ بہت وسیع مسجد میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے گفتگو کر رہے تھے۔ مسجد کے صحن کے ایک طرف آپ کو تھوڑی سی خالی جگہ نظر آئی۔ آپ نے فوراً تجویز پیش کر دی "اس جگہ دو صفیں بچھا کر مسجد بنادی جائے"، اس کو کہتے ہیں ثواب در ثواب یعنی مسجد در مسجد۔

آپ ہر قسم کے توڑ جوڑ کے ماہر ہیں۔ جس جگہ زندگی میں سکوت یا جمود ہو یعنی ہر طرح امن و امان ہو۔ آپ پل بھر میں وہاں ہل چل پیدا کر دیں گے۔ ایک پارٹی کی چار پارٹیاں بنانا آپ کے بائیں ہاتھ کا کمال ہے۔ اگر آپ سرکاری افسر نہ ہوتے تو کہیں سفیر ہوتے۔ یا پھر جیل میں موجود ہوتے۔ آپ بہت اچھے مقرر ہیں۔ کلب کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی تقریر اُن کو بہت اچھی طرح یاد ہے۔ ایک ہی تقریر سے بہت سا چندہ جمع کر سکتے ہیں۔ چندہ جمع کرنے کے لیے جمعرات کی قید نہیں۔

وہ دیکھیے ٹینس کورٹ میں ایک صاحب صاف ستھرا لباس پہنے ٹینس کھیل رہے ہیں۔ سیدھے سادھے ہلکے پھلکے الف تمام انسان ہیں۔ آپ ہیں صابری صاحب۔ کسی کالج میں پروفیسر ہیں۔ اور سر وارث شاہ کلاں انگریزی میں پڑھاتے ہیں۔ اکثر احباب اُن کو صارقی بھی کہہ لیتے ہیں۔ ان میں ایک خاص خوبی ہے۔ جب سر پر بڑا سا فیلٹ جو ان کو شاید الاٹ ہوا ہے رکھ لیتے ہیں تو واقعی پروفیسر نظر آتے ہیں۔ چاہے میٹرک کے ہی ہوں۔ مگر جب فیلٹ اُتار لیتے ہیں تو طالب علم کا شبہ ہوتا ہے۔ ٹینس کے بہت شوقین ہیں۔ تقریباً بیس سال سے کھیل رہے ہیں۔ توقع ہے کہ اگر بیس سال تک اور

کھیلتے رہے تو تھوڑی بہت ٹینس سیکھ جائیں گے۔ آپ عجیب عجیب نظریے پیش کرتے ہیں۔ رمی کے متعلق آپ کا نظریہ قابلِ قدر ہے۔ مگر افسوس قدر دان لوگ کلب میں کہاں۔ آپ فرماتے ہیں کہ "رمی ایک پیسہ پوائنٹ کھیلی جائے تو رمی ہے ورنہ جُوا ہے"۔ یہ تو اکثر سُنا تھا کہ چوری ہاتھی کی ہو یا چیونٹی کی بہر طور چوری ہی ہے۔ ان کے نظریہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چوری صرف ہاتھی کی ہی ہوتی ہے چیونٹی کی نہیں۔ آپ میں ایک خوبی اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ جتنے آپ سیدھے سادھے ہیں اتنا ہی ان کو سمجھنا مشکل ہے۔ بازار میں ملیں گے تو زور دیں گے۔ آپ اُن کی کلب کے ضرور ممبر بنیں کیونکہ آپ بہت اچھے ہیں۔ نیک ہیں۔ اچھی ٹینس کھیل سکتے ہیں۔ کلب آپ پر فخر کرے گی۔ آپ اُن کے اکسانے پر ممبری کے لیے درخواست دے دیں گے اور جب آپ کا نام ممبری کے لیے کمیٹی کے اجلاس میں پیش ہوگا تو صابری صاحب خود سب سے زیادہ آپ کی مخالفت کریں گے اور وہ بھی انگریزی میں۔ صابری صاحب زندہ باد۔

آپ ان کو دیکھ رہے ہیں۔ وہ جو صاحب عینک لگائے آسمان کی طرف مُنہ اُٹھائے چلے آ رہے ہیں —— ان سے ہاتھ ملائیے۔ آپ ہیں مسٹر گل عباسی۔ آپ بیک وقت خود داری اور انکساری کا مجسمہ ہیں۔ ایک ہی وقت میں آپ کی گردن اکڑی ہوئی اور نظریں نیچی ہوں گی۔ آپ کا سر آسمان کی طرف اُٹھا ہوا ہوگا مگر آنکھیں زمین کی طرف جھکی ہوئی ہوں گی۔ آسمان کی طرف منہ کر کے زمین کی طرف دیکھنا کچھ آپ کا ہی حصہ ہے۔

لیجیے ان صاحب سے ضرور ملیے۔ وہ جو سامنے لمبے سے قد کے چہرے پر غصہ کے آثار لیے بیٹھے ہیں۔ ان کے ماتھے پر بے شمار بل دیکھ کر یہ نہ سمجھ لیں

کہ آپ واقعی غصے میں ہیں بلکہ ماتھے پہ بل ڈالنا اُن کی رہا بی ہے۔ ان کو کلب میں کمال کلیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ آپ بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں۔ آپ ایک ہی بات کے حق میں اور خلاف یکساں روانی سے بول سکتے ہیں۔ اگر آپ کسی بات کے حق میں ان سے کچھ کہلوانا چاہیں تو خود اس کے خلاف گفتگو کا آغاز کر دیں۔ آپ کا مقصد حل ہو جائے گا۔ جب کمال کلیم صاحب بول رہے ہوں تو یہ خیال نہ کریں کہ وہ جھگڑ رہے ہیں۔ اُن کے بولنے کا انداز ہی کچھ ایسا ہے کہ خواہ مخواہ جھگڑے کا گمان ہوتا ہے۔

افواہ ہے کہ کسی نے اُن کو کبھی ہنستے نہیں دیکھا۔ اگر کوئی ممبر ہنس پڑتا ہے تو آپ اُس کو حیرت سے دیکھتے ہیں کہ اس کو کیا ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ ہنسنے کا کام کلیم صاحب مسکرانے سے لیتے ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ مسکرانے کا کام کس چیز سے لیتے ہیں۔ آپ کے ماتھے پہ اتنے شکن ہوتے ہیں کہ ان پر جیومیٹری کی اشکال کا شک ہونے لگتا ہے۔ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ جب اُن کے ماتھے پہ بہت زیادہ شکنیں ہوں تو یہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ ان کے بہت گہرے اور قریبی دوست ان کے ماتھے کی شکنیں گن کر معلوم کر لیتے ہیں کہ اس وقت یہ کس موڈ میں ہیں۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ آپ اصول کے پکے انسان ہیں۔

وہ سامنے دیکھیے ایک صاحب میز پہ تشریف فرما ہیں۔ تاش کے پتوں سے شغل فرما رہے ہیں۔ بال اُلجھے ہوئے ہیں۔ داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔ لباس میلا تو ہرگز نہیں مگر دھوبی کے ہاں جانے کے قابل ضرور ہے۔ آپ ہیں بابو امیر محمد۔ بہت عقلمند اور ہوشیار آدمی ہیں۔ آپ ضرور کسی ریاست میں وزیر تعلیم

ہوتے مگر کمی ان میں ایک بات کی ہے کہ آپ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ قلم کی جگہ انگوٹھا استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے کلب کے ممبران ان کو بابو امیر محمد یا ڈاکٹر امیر محمد کہتے ہیں۔ آپ بزنس کرتے ہیں۔ تمام شہر کو وٹامن مہیا کرنا خواہ وہ بینگنوں کی شکل میں کیوں نہ ہو آپ کا کام ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ اتنے بڑے کلب کے ممبر کیسے بن گئے۔ کلب کی ممبری کے لیے شرط یہ ہے کہ درخواست دہندہ یا تو گریجوایٹ ہو یا ٹیکس ادا کرتا ہو۔ آپ نے اپنی درخواست میں لکھا تھا کہ میں سینما کا تفریحی ٹیکس ادا کرتا ہوں۔ آپ اسی پہ ممبر منتخب ہو گئے تھے۔ اور بہت پرانے ممبر ہیں۔

لیجیے ان صاحب سے فوراً ہاتھ ملائیے۔ ہاں ہاں گھبرائیے نہیں انہی سے کہہ رہا ہوں جو پتلون اور بشرٹ پہنے ذرا بھاری جسم کے حضرت پہلوانوں کی طرح دونوں بازو پھیلائے چلے آرہے ہیں۔ یہ ہیں فاروق سہگل۔ ان کا شمار شہر کے قانون دانوں میں ہوتا ہے۔ یہ کلب کے آنریری سرکاری وکیل ہیں انہیں قانون میں اتنی مہارت ہے کہ دور سے ہی کتاب کی جلد کا رنگ دیکھ کر بتادیں گے کہ کون سی کتاب ہے۔

یہ جب پریکٹس کرتے تھے اس وقت کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ایک قتل کے مقدمے میں یہ بطور وکیل صفائی پیش ہوئے لیکن ملزم کو بدقسمتی سے پھانسی کی سزا ہوگئی۔

اس بے چارے نے ان سے پوچھا "جناب اب کیا ہوگا"

انہوں نے مسکرا کر کہا۔ "چلو اچھا ہی ہوا عمر قید ہوتی تو تمام عمر تکلیف رہتی۔ اب تو صرف دو منٹ کی تکلیف ہے۔ اس کے بعد تمام دکھوں سے چھٹکارا لاؤ ہاتھ ملاؤ۔ اب قیامت کے دن ملاقات ہوگی۔ اور اللہ کی عدالت میں اپیل۔

کریں گے۔"

ملزم نے گھبرا کر پوچھا: "خدا نخواستہ وہاں بھی آپ ہی میری وکالت کریں گے۔"

انہوں نے جواب دیا: "فکر نہ کرو اُس وقت تک قانون کی کتابوں کو دیمک چاٹ چکی ہو گی۔ اور میں تمہیں صاف بری کرا لوں گا آخر فیس لی ہے تو حلال بھی کروں گا۔

مسٹر فاروق اپنے آپ کو سہگل کہتے ہیں اور اس پہ فخر کرتے ہیں خیال تھا کہ ان کا کوئی تور ملزمین کوئی حصہ ہو گا۔ اِس لیے سہگل کہلاتے ہیں۔ مگر ان کی زبانی پتہ چلا کہ آنجہانی کے ایل سہگل کے ساتھ ان کی دوستی تھی چنانچہ انکی نسبت سے سہگل کہلانے لگے۔"

فاروق سہگل انگریزی پکچر شوق سے دیکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر باقاعدہ انگریزی پکچر دیکھتا رہا تو کبھی نہ کبھی انگریزی ضرور سمجھ لوں گا۔

ان سے پوچھا گیا۔ "جب آپ ہال میں انگریزی نہیں سمجھ سکتے تو کیا کرتے ہیں۔"

ارشاد ہوا: "جب لوگ ہنستے ہیں میں ہنس پڑتا ہوں اور جب وہ چُپ ہوتے ہیں تو میں چپ ہو جاتا ہوں۔ وہاں اور بھی ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں۔"

اب ادھر دیکھیے وہ سامنے جو جوان ٹینس کھیل رہے ہیں ان کا نام ہے راجہ مظفر۔ آپ شہر کے بہت بڑے رئیس ہیں۔ کسی زمانے میں تمام شہر کے مالک تھے لیکن کچھ عرصہ بعد شہر کی آبادی اور رقبہ دو گنا ہو گیا۔ تو آپ صرف آدھے شہر کے مالک رہ گئے اور آجکل چونکہ شہر کی آبادی اور رقبہ چار گنا ہو گیا ہے اس لیے آپ

صرف چوتھے حصے کے مالک ہیں۔ فکرِ معاش سے بالکل آزاد ہیں مگر بہت مصروف انسان ہیں۔ رات کے دو بجے سونا نصیب ہوتا ہے۔ صبح ساڑھے گیارہ بجے بیڈ ٹی نصیب ہوتی ہے۔ دن کو بارہ بجے کے قریب صبح کی سیر کے لیے جاتے ہیں دوپہر ایک بجے کھانا کھا کر دوستوں سے گپ شپ کے لیے نکل جاتے ہیں۔ اور شام کو چار بجے چار پی کر ٹینس کھیلنے کے لیے کلب آجاتے ہیں اور پھر بلیرڈ کھیلتے ہوئے رات کا ایک بج جاتا ہے۔ مجبوراً گھر جانا پڑتا ہے اور پھر کھانا کھا کر دو بجے سونا نصیب ہوتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میری زندگی تو ایسی بے کیف ہے جیسے کسی شاعر نے کہا ہے۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے

عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

آپ کو انگور بہت مرغوب ہیں کھٹے بھی ہوں تو پروا نہیں کرتے۔ انگور کا رس اگر انگریزی بوتلوں میں بند کیا ہوا مل جائے تو پھر سبحان اللہ۔

کیا آپ ان حضرت سے نہیں ملے۔ یہی جن کی لمبی چوڑی سینما سکوپ داڑھی ماسٹر تارا سنگھ کی داڑھی کی کاربن کاپی معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا ابھی ابھی ٹینس کورٹ سے نکلے اور بیڈمنٹن کورٹ میں جا گھسے۔ تو صاحب یہی مولانا فیض الاسلام ہیں۔ آپ ہر فن مولا ہیں ٹینس۔ بیڈمنٹن۔ ٹیبل ٹینس۔ شطرنج۔ برج۔ رمی، غرضیکہ ہر کھیل کھیلتے ہیں۔ اور پھر عشاء کی نماز پڑھ کر گھر چلے جاتے ہیں۔ مولانا چونکہ ہر کھیل میں شریک ہوتے ہیں اس لیے بعض ممبران کی رائے ہے کہ مولانا در اصل کلب میں اپنا چندہ نچوڑنے آتے ہیں۔ مولانا سے ایک خاص قسم کی روحانی سی خوشبو آتی رہتی ہے۔ بعض اوقات تو شک گذرتا ہے کہ کہیں ان کی پتلون کی جیب میں جلتی ہوئی اگر بتی تو نہیں۔ یا انھوں نے

سر پر اگر بتی کا تیل تو نہیں لگایا ہے۔

کلب کے الیکشن کے دنوں میں مولانا دروازے کے قریب بیٹھتے ہیں تاکہ کرسیوں اور میزوں کو جلال آنے کی صورت میں سب سے پہلے باہر نکل سکیں۔

ادھر ایک صاحب ذرا بھاری جسم کے کرسی پر بیٹھے سگریٹ کا دھواں اُڑا رہے ہیں۔ شلوار قمیص ان کا محبوب لباس ہے۔ انہیں خواجہ غلام محمد کہا جاتا ہے۔ آپ بہت ہی کم گو ہیں۔ ہر بات کا جواب بہت مختصر اور ایک جیسا دیتے ہیں۔

ایک ممبر نے ان سے کہا "خواجہ صاحب کلب کا انتظام بہت خراب ہے"

آپ نے جواب دیا "جی ہاں۔ بہت"

وہ ممبر پھر بولے "کلب کی حالت کو ٹھیک کرنا چاہیے"

آپ نے کہہ دیا "ضرور"

وہ پھر کہنے لگے "یا پھر کلب کو چھوڑ دینا چاہیے"

آپ نے تائید کی "بالکل"

اب دیکھیے، ایک دوسرے ممبر آپ سے مخاطب ہو رہے ہیں۔

"خواجہ صاحب کلب میں آج کل بہت رونق ہے"

آپ بولے "جی ہاں بہت"

اُنہوں نے کہا "کلب ان شاء اللہ اور بھی ترقی کرے گا"

آپ نے جواب دیا "ضرور"

پھر اظہارِ خیال کیا گیا "روز بروز ممبروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اب ہمیں بعض حضرات کو لینے سے انکار کرنا پڑے گا"

خواجہ صاحب نے جواب دیا "بالکل"

دیکھا آپ نے خواجہ صاحب نے ایک ہی جواب سے دونوں ممبروں کو بھگتا دیا۔ اگر کوئی تیسرا ممبر بھی ان سے بات کرے گا تو اس کو بھی اسی نوعیت کے جواب ملیں گے۔ بس یہ ان ہی کی خوبی ہے۔ آپ میں ایک صفت اور ہے۔ وہ یہ کہ صبح ایک دیاسلائی جلاتے ہیں اور اُسی سے رات گئے تک سگریٹ پیتے رہتے ہیں۔

آپ کے سامنے ٹینس کورٹ میں ایک نوعمر ممبر ریکٹ لیے اچھل کود رہے ہیں۔ کبھی تو گیند کو جال پر پھینک دیتے ہیں اور کبھی پردے کے اوپر سے باہر۔ آپ ہیں مسٹر اکرام۔ ابھی ابھی قانون پاس کیا ہے۔ وکالت کرتے ہیں۔ بہت ہی نوعمر ہیں۔ اس لیے یار لوگ ان کو بے۔بی وکیل کہتے ہیں۔ آپ کلب کو چندہ دینے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں اُس کورٹ میں فیس لیتا ہوں۔ اس کورٹ میں چندہ کیوں دوں۔ یہ اپنے پیشے میں بہت ترقی کریں گے۔ خود کہتے ہیں "میرے لیے ترقی کا بہت میدان ہے۔ میدان تو اور بھی صاف ہو جائے اگر پرانے اور تجربہ کار وکیل کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں"۔

اب آپ کا تعارف، کلب کی ایک مشہور و معروف ہستی سے کرا دیا جائے۔ دیکھیے سامنے ایک بھاری بھرکم حضرت جھومتے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ ان کو آتا دیکھ کلب کے چوکیدار نے ایک کرسی کے ساتھ دوسری کرسی جوڑ کر رکھ دی ہے۔ اور یہ حضرت آکر دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ انہیں مسٹر صادق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جن دنوں میں خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم تھے۔ آپ کہا کرتے تھے "مجھ میں اور خواجہ صاحب میں اتنا سا ہی فرق ہے کہ وہ وزیر اعظم ہیں اور میں نہیں۔ ویسے ان سے کس بات میں کم ہوں۔

کھانے پینے میں چند قدم آگے ہی ہوں۔"

ان کے دو لطیفے ان کی زبانی سنیے۔ فرماتے ہیں:۔

"جن دنوں صحت اچھی ہوتی تھی۔ ایک دن بازار میں جا رہا تھا تو دیکھا سڑک پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تانگے کے گرد لوگ جمع ہیں اور گھوڑا زمین پر لیٹا ہوا ہے۔ بسیار کوشش کے باوجود اُٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ لوگ کوشش کر کے ہار چکے تھے۔ میں نے لوگوں کو ہٹایا اور کسی سے ایک اسٹول منگوایا۔ اسٹول پر چڑھ کر میں تانگے کی پچھلی سیٹ پر جو گھوڑے کے بیٹھنے سے اونچی ہوگئی تھی چڑھ گیا۔ میرا نشست پر قدم رکھنا تھا کہ گھوڑا ایک جھٹکے کے ساتھ ایسا اُٹھا جیسے کرین نے اُٹھا دیا ہو۔

دوسرا لطیفہ بیان کرتے ہیں:۔

مجھے تیرنے کا بہت شوق تھا۔ ایک سوئمنگ پول کا ممبر تھا۔ اونچی سے اونچی جگہ سے چھلانگ لگا سکتا تھا۔ ایک دن تیرنے کے لیے گیا۔ اس وقت پول میں انگریزوں کے چند چھوٹے چھوٹے بچے تیرنا سیکھ رہے تھے۔ میں نے بلندی سے تالاب میں چھلانگ لگا دی۔ میرے دھم سے گرتے ہی تالاب کا پانی تیزی کے ساتھ کئی فٹ بلند ہو کر باہر جا گرا۔ اور ساتھ ہی چند بچے بھی اُچھل کر کنارے سے باہر جا گرے۔

اب آپ مسٹر اقبال احمد سے بھی مل لیجیے۔ آپ شاعر ہیں۔ تخلص کی تلاش میں ہیں اور ابھی تک بغیر تخلص کے کام چلا رہے ہیں۔ اپنا کلام بعنوان

"دیوانِ خاص و عام" چھپوانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ دیوان چار سو بیس صفحوں پہ مشتمل ہوگا۔ ابھی آپ نے صرف تین صفحے مکمل کیے ہیں۔ ان تینوں صفحوں کے کلام کا انتخاب ملاحظہ فرمائیے۔ ایک شعر ہے۔

جو بلی نے چاٹا ہے بکری کی دم کو
تو بکری بھی چاٹے گی بلی کی دُم کو

ایک ڈھائی مصرعوں کے شعر پر غور کیجیے :۔

نہیں آتے وہ میرے گھر تو اُکا ہی نہیں آتے
مگر جب آنے لگتے ہیں تو ایسے جس طرح ہچکی
اور پھر ہچکی پہ دے ہچکی

ان کی ایک نظم کا عنوان ہے —— "سی۔ آئی۔ ڈی۔ نظم کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے :۔

جلد بتلا کہ وہ کہاں ہے
ڈھونڈ کر لا اُسے جہاں ہے
گر تجھے نہیں وہ ملتا کہیں
جا دیکھ شاید وہ وہاں ہے
دیکھ جا کر اُسے اُس کمرے میں
شاید کہ پلنگ پہ خفتہ باشد

ان کا ارادہ ہے کہ جب کبھی دیوان مکمل ہو جائے تو دیوان کا دوسرا ایڈیشن پہلے شائع کرایا جائے۔ اور جب وہ ختم ہو جائے تو پھر پہلا ایڈیشن شائع ہو، کیونکہ اگر پہلے ہی پہلا ایڈیشن شائع کرا دیا تو ہو سکتا ہے کہ دوسرا ایڈیشن شائع کرانے کی نوبت ہی نہ آئے۔ کسی حد تک ان کا خیال درست ہے۔

کلب میں ایک اَور ہستی بھی ہے۔ کلب کا چوکیدار شاہ جی۔ یہ کلب کے ممبران کے لیے چار بناتا ہے۔ تیس روپے مہینہ تنخواہ لیتا ہے۔ بہت نیک ہے، تمام تنخواہ ممبروں کو چار پلانے میں لگا دیتا ہے۔ لکھنے پڑھنے میں بہت ہوشیار ہے۔ اس کے پاس ایک کاپی ہے جو ممبروں کے ناموں اور اُن کے چائے کے حساب سے بھری ہوئی ہے وہ اس کو اکثر دیکھتا اور رقمیں یاد کرتا رہتا ہے۔ اس کو تمام ممبروں کا حساب زبانی یاد ہے جس سے گمان ہوتا ہے اگر وہ میٹرک کا امتحان دے تو کم از کم حساب کے مضمون میں اول آسکتا ہے۔ لیکن اس کا امتحان دینے کا ارادہ نہیں۔ اس کو ممبروں سے رقم وصول نہیں ہو رہی، اس لیے اس کا خیال ہے کہ اپنی اس کاپی کو چھپوا کر یونیورسٹی سے دسویں کے لیے حساب کی کتاب کی جگہ منظور کرائے۔ شاید اس طرح کمی پوری ہو جائے اور اس کی رقم وصول ہو جائے۔

ہمارے دوست

دوست ایک نعمت ہے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے جس کا کوئی دوست نہیں وہ بدقسمت انسان ہے۔ بزرگوں میں ایک خوبی ہے کہ جو کچھ وہ فرماتے ہیں ٹھیک فرماتے ہیں۔ اور دوسری خوبی یہ ہے کہ فرما کر انتقال کر جاتے ہیں۔ گو ہم نے ابھی انتقال نہیں کیا اور نہ اس کا خیر کا ابھی کوئی ارادہ ہے مگر ہم ان کے فرمائے ہوئے میں اتنا اضافہ کرنا چاہتے ہیں کہ جس شخص کے بہت زیادہ دوست ہیں وہ سب سے زیادہ بدقسمت انسان ہے۔ خوش قسمت صرف وہ ہے جس کا ایک ہی دوست ہے اور جس کا ایک بھی دوست نہیں وہ مہا خوش قسمت انسان ہے جیسے مہاتما گاندھی۔ مہاتما جی کے پرستار سب تھے مگر دوست کوئی نہ تھا۔ روحانی لحاظ سے اور دنیاوی لحاظ سے۔

مجھے میرے دوست بہت عزیز ہیں وہ ہمیشہ میرے نا خالص پسینے پر اپنا خالص خون بہانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ میں نے ہی ان کو موقع نہیں دیا۔ ورنہ میرا پسینہ اور اُن کا خون ایک ہو گیا ہوتا۔ میں اپنا وقت زیادہ تر اپنے دوستوں کے پاس گزارتا ہوں۔ اس لیے اکثر رات کو دیر سے گھر آتا ہوں اور یہ دیر سے گھر آنا میری بیوی کے لیے ناراضگی کا باعث ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتی ہے اور غصہ میں تقریر کرتی ہوئی اپنی زبان کا بھی ایک آدھ لفظ بیچ میں ٹکا جاتی ہے۔ مثلاً آدھی آدھی رات تک کہاں دکھے، کھاتے پھرتے ہو۔ دکھے،

پنجابی زبان کا لفظ ہے۔ اور اتنا وسیع ہے کہ اس کا ترجمہ کسی زبان میں ممکن نہیں دکھے، کا مطلب صرف کھانے سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ الفاظ کے ذریعہ ناممکن ہے۔

جب میں اپنی بیوی کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ میں اِدھر اُدھر کہیں رکھے، کھاتے نہیں گیا تھا بلکہ اپنے دوستوں کے پاس تھا تو اس پر وہ سیخ پا ہو جاتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ میرے پیارے دوست جن کی میں تعریف کرتا ہوں اور جن کے متعلق میرا خیال ہے کہ میرے پسینے پر خون بہانے والے ہیں در اصل خوش فہمی ہے اور یہ "یارانِ این زمانہ" بالفاظ دیگر گل اندام ہیں۔ جن میں بوئے وفا کا نام ونشاں نہیں۔ خدا نخواستہ کسی دن کوئی مصیبت در پیش آئی یا ضرورت پڑی تو کسی کام نہ آئیں گے بلکہ شکل بھی نہ دکھائیں گے۔ گدھے کے سر پر سینگ نظر آجائیں گے مگر یہ دوست دکھائی نہ دیں گے۔ اس بات پر اُس کی اور میری تکرار رہتی ہے اور جتنا ہی میں اپنے دوستوں کی خوبیاں بیان کرتا ہوں اُن کی وکالت کرتا ہوں میری بیوی اور برہم ہوتی ہے اور تنگ آکر کہتی ہے وقت آنے پر معلوم ہو گا کہ یہ کیسے دوست ہیں اور دوستوں کے متعلق آخر میں ہمیشہ اپنے نانا جان مرحوم و مغفور کی ایک حدیث بیان کر دیتی ہے ــــ "بھلا ہوا ہم پر پڑا وقت، ہوئی دوست دشمن کی پہچان"۔ اور میں یہی کہتے کہتے کہ میرے دوست ایسے ہرگز نہیں سو جاتا ہوں۔ اور خواب میں پھر اپنے عزیز دوستوں کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔

ایک رات معمول کے مطابق دیر سے گھر پہنچا۔ اور معاملہ حد سے آگے بڑھ گیا۔ بیوی نے ایک تو کرار بات کہہ دی۔

"اگر دوستوں پر اتنا ناز ہے تو تجربہ کر کے دیکھ لیجیے"۔

ہم بھی تیار ہو گئے اور کہہ دیا :" جو کہو منظور ہے "

بیوی نے کہا :" پہلے چیک بُک میرے حوالے کیجیے "

میں نے چیک بُک نکال کر اُن کی خدمت میں پیش کر دی۔

بیوی صاحبہ بولیں :۔۔۔ صبح کسی دوست کے پاس جائیے اور صرف دو سو روپیہ قرض مانگ کر لائیے۔ مگر شرط یہ ہے کہ یہ قرض صرف ایک ہی دوست سے لیا جائے۔ مختلف دوستوں سے یہ رقم اکٹھی نہ کی جائے "

میں نے یہ چیلنج فوراً منظور کر لیا۔ یہ تو ایک معمولی سی بات ہے میرا تو ایک ایک دوست دو سو تو کیا دو ہزار تک دے سکتا ہے۔ رات بڑی تسلی کے ساتھ سویا۔ اور رات کو خواب میں دوستوں سے قرض اکٹھا کرتا رہا۔ اور جس دوست کے پاس بھی گیا اُس نے دو سو کے بجائے چار سو دیئے۔

صبح اُٹھا۔ اتوار کا دن تھا۔ چاء وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے دوستوں کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں سوچنے لگا کہ سب سے پہلے کس دوست کے پاس جا کر سوال کروں۔ سوچا چلو پہلے شیخ عبدالرؤف کے پاس چلتا ہوں۔ بہت عزیز دوست ہیں۔ جاتے ہی کام بن جائے گا۔ اور پھر کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ان کی کوٹھی جتنی قریب آرہی تھی اتنے ہی اپنے پاؤں سست ہوتے جا رہے تھے۔ اور کچھ کچھ شرم بھی محسوس ہو رہی تھی۔ رؤف صاحب بڑے تپاک سے ملے۔ کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ ہر بار حوصلہ کرتا تھا کہ مدعا بیان کر دوں۔ مگر زبان تک بات نہ آتی تھی۔ آخر ہمت اور حوصلہ سے کام لے کر اور آنکھیں ذرا بند کر کے سوال کر ہی دیا ۔۔۔۔۔۔" بھائی مجھے دو سو روپیہ کی اشد

ضرورت ہے اور روپیہ فوراً چاہیے۔ عنایت کیجیے،
جلد واپس کر دیا جائے گا۔"

رؤف صاحب بولے: "ارے یار یہ تو ایک معمولی سی بات ہے۔
مگر تم جانتے ہو آج اتوار ہے چھٹی ہے۔ بنک بند ہے۔ اور پھر
میں نے کل ہی بنک سے کافی روپیہ نکلوایا ہے۔ اگر کل کسی وقت
مجھے کہتے دو سو کیا دو ہزار دے دیتا۔ اس وقت مجبوری ہے —
میں شرمندہ ہوں کہ ایک معمولی سی بات بھی نہ ہو سکی۔"
اور پھر ذرا ٹھہر کر ٹرخانے کے لیے بولے۔" اگر چند دن انتظار کرو تو
بندوبست ہو جائے گا۔"

یہاں کام نہ بنا۔ اور میں رؤف صاحب سے اجازت لے کر چودھری
فیض کی طرف روانہ ہوا۔ ان سے ملاقات ہوئی۔ رؤف صاحب سے
بھی زیادہ تپاک سے ملے۔ اب مجھے حوصلہ ہوا کہ ان سے کام ضرور بن جائیگا۔
ہو سکتا ہے کہ رؤف صاحب کو واقعی مجبوری ہو۔ جو اکثر اوقات انسان کو ہو
جاتی ہے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ان سے اپنی "تشریف آوری" کا مدعا
بیان کیا۔

افسوس کرتے ہوئے بولے۔" ارے بھائی ذرا دس منٹ پہلے آجاتے
میرے پاس چھ سو روپیہ تھا جو ابھی قریشی صاحب مانگ کر لے گئے ہیں۔
یہ تو بالکل معمولی بات تھی۔ میں چار سو ان کو دے دیتا اور دو سو آپ کو۔ اس
وقت تو گھر میں ایک پیسہ بھی نہیں۔ مجھے سخت افسوس ہے یا پھر چند دن ٹھہر
جاؤ جب قریشی صاحب واپس کریں گے تو تم لے جاؤ۔"

دل میں سوچا چودھری صاحب ٹھیک ہی کہتے ہوں گے بظاہر ان کو مجھ

سے زیادہ افسوس ہے۔ اس وقت ہو سکتا ہے انہیں مجبوری ہو۔ اب چلو اقبال حکیم صاحب کی طرف چلتے ہیں۔ جگری دوست ہیں۔ گو ان کا جگر خراب رہتا ہے۔ اقبال صاحب ان دونوں سے بڑھ کر زیادہ تپاک سے ملے۔ فوراً چائے تیار کرانے کا حکم نامہ جاری کر دیا۔ چائے بعد جب کسی بہانہ سے سوال کیا گیا تو کہنے لگے ــــ "ارے بھائی تم سے کیا چھپا ہے۔ میرا بنک کا حساب دیکھ لو۔ کبھی کچھ بچا ہی نہیں۔ اللہ کے فضل سے گیارہ بچے ہیں اور ریٹائر ہونے میں ابھی بارہ سال ہیں۔ دیکھیئے کہاں تک نمبر پہنچتا ہے۔ لوگوں کے کھانے پر اتنا خرچ ہوتا ہو گا جتنا میرا صرف ان کے ناشتہ پر اُٹھ جاتا ہے"۔ــــ اور پھر ہنس کر کہنے لگے "جب کبھی ان کے لیے گیارہ جوڑے جوتوں کے خریدنے جاتا ہوں دوکاندار حیرت سے دیکھتا ہے۔ جیسے کہہ رہا ہو صاحب یہ اپنے بچوں کے لیے ہیں یا محلہ کے بچوں کے لیے"۔

تین جگہ مایوسی اور ناکامی کا سامنا ہو چکا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب آخری بار صرف میاں افضل کریم سے سوال کیا جائے۔ وہ بزنس مین ہیں۔ ان کے لیے دو سو روپیہ کیا مشکل بات ہے۔ میاں صاحب سے ایک بہانے سے سوال کیا۔ ــــ "فلاں دوست میرے پاس آیا ہے اور اس کو دو سو روپیہ کی فوری ضرورت ہے۔ چند دنوں میں روپیہ واپس کر دیا جائے گا۔ ذمہ داری میری ہے"۔

میاں صاحب بزنسانہ انداز میں مسکرا کر بولے ــــ "بھائی سچ بات تو یہ ہے کہ اپنے لیے چاہیے تو جتنا مرضی ہو لے جاؤ۔ لیکن دوسروں کے معاملے میں کیوں پڑتے ہو۔ اور پھر یہ دیکھ لو بنک کی پاس بُک۔ اتفاق کی بات ہے اس میں رہا ہی کچھ نہیں۔ مال خریدنے کے لیے تمام پیسہ کراچی بھیج دیا ہے"۔

میاں صاحب نے بنک کی دو پُرانی کتابیں اُٹھا کر میرے سامنے رکھ دیں۔

غرض میاں صاحب نے بڑے خوبصورت طریقے سے ٹال دیا۔

سخت مایوسی ہوئی۔ خفت اور شرمندگی کا یہ عالم تھا کہ گھر جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ بیوی واقعی سچ کہتی ہے کہ مصیبت کے وقت دوستوں کی پہچان ہو جاتی ہے اور اس کے نانا جان مرحوم کی حدیث بھی درست ہے۔

مُنہ لٹکائے ہوئے گھر آئے۔ بیوی نے فوراً تاڑ لیا کہ کام نہیں بنا۔ خوشی سے بولیں۔

"ایسے ہمدرد اور پیارے دوست مبارک ہوں!"

ہم نے شرمندگی سے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اور اپنے کمرے کا رُخ کرتے ہوئے دل میں عہد کیا کہ آئندہ ان دوستوں سے بہت کم ملیں گے۔ یہ لوگ اپنا خون اپنے پسینے پر ہی بہائیں۔ ہمیں معاف کریں۔

میں چھوڑ آؤں!

ایک شام مکان کے باہر موٹر سائکل رُکنے کی آواز آئی۔ دروازہ کھولا تو دیکھا کہ بیگم تصدق احمد راجہ تصدق حسین صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ دونوں کو دیکھ کر حیرت اور مسرت ہوئی۔ حیرت اس لیے کہ یہ اچانک کہاں سے آگئے اور مسرت اس لیے کہ بہت عرصے کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔

بیگم تصدق کے مُنہ سے نکل گیا "آٹھ دس ماہ سے پنڈی میں ہیں"

اس پر رسمی طور پر میری بیوی کا گلہ کرنا لازمی بات تھی "آٹھ دس ماہ سے یہاں ہو اور آج آئے ہو۔ کبھی اطلاع کرنے یا تشریف لانے کی تکلیف گوارا نہ کی"

بیگم تصدق کو افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ بات مُنہ سے نکل گئی۔ پھر بھی اُنھوں نے عام چلتا ہوا بہانہ کیا "آپ کا پتہ معلوم نہ تھا۔ بڑی مشکل سے ادھر ادھر سے پوچھ کر آئے ہیں۔ اگر گھر کا پتہ معلوم ہوتا تو سب سے پہلے آتے"

تصدق صاحب سعادت مندی سے ہاں میں ہاں ملانے لگے۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ جاتے ہوئے بیگم اور تصدق صاحب زور دے گئے کہ اُن کے ہاں ضرور آنا پڑے گا۔ تصدق صاحب نے آسان پتہ یہ بتایا کہ "سٹلائٹ ٹاؤن میں آکر ریڈیو سنگر سلیقہ بانو کے گھر کا پتہ پوچھ لیجیے اس کے گھر کے ساتھ جو بائیں طرف مکان ہے وہ میرا ہے اور میرے نام کا بورڈ بھی لگا ہوا ہے"

ایک اتوار صبح چائے کے بعد محترمہ بیگم صاحبہ نے رعب سے کہا۔

"تصدق خان (یہ میاں بیوی کی جمع بتائی گئی تھی) کیا کہتے ہوں گے۔ آپ آج جا کر اُن کا گھر دیکھ آیئے۔ آئندہ اتوار کو ہم سب چلیں گے۔"

میں نے بہت کہا: "آپ بھی ساتھ چلیں۔ گھر معلوم کرنا تو آسان ہے۔ پتہ وہ بتا گئے ہیں۔"

بیگم صاحبہ نے کہا: "ہو سکتا ہے کہ وہ مکان پہ نہ ملیں۔ مجھے چکر پڑے موٹر سائیکل ان کے پاس ہے اس پر اُڑتے پھرتے ہیں۔ شاید تجمل صاحب کے یہاں چلے گئے ہوں۔ آج آپ اُن سے پکی بات کر آئیں۔ آئندہ اتوار کے لیے۔"

کالج روڈ سے سیٹلائٹ ٹاؤن دو ڈھائی میل ضرور ہوگا۔ میں پیدل روانہ ہوا کہ چلو آج سیر ہی سہی سٹلائٹ ٹاؤن کے چکر سے ابھی میں تقریباً سو ڈیڑھ سو گز کے فاصلہ پر تھا کہ سامنے سے ایک ملنے والے کا اکاونٹس افسر آتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے ساتھ ایک جوان سائیکل ہاتھ میں لیے پیدل آ رہے تھے قریب آئے تو دو ایک باتوں کے بعد میں نے اُن سے سلیقہ بانو کے گھر کا پتہ پوچھا اکاونٹس افسر صاحب مجھے رستہ سمجھانے لگے لیکن سائیکل والے صاحب نے سائیکل کا رخ موڑتے ہوئے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ "آیئے میں آپ کو چھوڑ آوں۔"

میں نے عرض کیا: "آپ کو تکلیف ہو گی۔"

وہ صاحب کہنے لگے۔ "اجی تکلیف کس بات کی۔ ایک منٹ میں چھوڑ آوں گا۔ آپ سائیکل کے پیچھے بیٹھ جایئے۔"

میں تھک تو گیا تھا۔ دل تو چاہا کہ ان کی خدمات سے فائدہ اُٹھایا جائے غلطی سے کہیں میں نے کہہ دیا: "اصل میں مجھے سلیقہ بانو کے ساتھ والے گھر میں

جانا ہے۔ وہاں میرے ایک عزیز رہتے ہیں۔"

نوجوان کی سائیکل کا رُخ خود بخود بدل کر "اباؤٹ ٹرن" ہو گیا۔ اور اُنھوں نے کہا۔ "یہ نزدیک ہی گھر ہے۔ پہلے ادھر جائیے۔ پھر اُدھر، پھر اِدھر اور پھر اُدھر" وہ ہاتھ سے اشارے کرتے ہوئے سلام مارتے ہوئے یہ جا وہ جا۔"

میں نے پھر چیکہ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ چکر کراس کیا اور بائیں طرف مُڑ گیا۔ تھوڑی دور جا کر ایک سڑک کی دو بن گئیں۔ ایک بائیں طرف اور ایک دائیں طرف۔ ابھی کھڑا سوچ رہا تھا کہ کس طرف جاؤں کہ سامنے سے ایک موٹا سا لڑکا جو پندرہ سال عمر ہو گی نمودار ہوا۔

میں نے اُس سے پوچھا۔" بھئی آپ کو سلیقہ بانو کے گھر کا علم ہے کس طرف ہے۔

برخوردار بولے۔" سلیقہ بانو۔ ریڈیو والی۔ آئیے میں چھوڑ آؤں۔ قریب ہی ہے۔

میں نے کہا۔" نہ میاں تکلیف کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے رستہ بتا دو میں خود چلا جاؤں گا۔"

لڑکا بولا۔" کوئی تکلیف نہیں۔ آپ مجھے سلیقہ بانو کے آٹوگراف لے دیں میں چھوڑ آتا ہوں۔"

میں نے کہا بھئی بات یہ ہے کہ مجھے سلیقہ بانو کے ساتھ والے گھر میں جانا ہے۔ یہ تو نشانی کے طور پر پوچھ رہا ہوں۔ پتہ بتا کر مجھ سے آٹوگراف لے لو۔"

وہ لڑکا جاتے جاتے بولا۔" اچھا یہ بات ہے تو بائیں طرف چلے جائیں آگے چورستے پر جا کر پھر پوچھ لیں۔"

بائیں طرف تھوڑی دور گیا تھا چورستہ تو نہ آیا بلکہ تین راستے آ گئے میں

پھر رُک گیا کہ کوئی نظر آئے تو اُس سے پوچھوں۔ اتنے میں سامنے سے ایک مولانا صاحب کچھ پڑھتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ شاید وظیفہ کر رہے تھے میں نے ادب سے السلام علیکم کہا مطلب یہ تھا کہ ذرا رُک جائیے۔ کچھ کہنا ہے۔ مگر وہ قرأت کے ساتھ وعلیکم السلام کہتے ہوئے نکل گئے۔

میں نے پھر ادب سے عرض کیا۔" قبلہ ذرا سنیے تو "

قبلہ نے کچھ توجہ نہ دی۔ صرف گھوم کر میری طرف دیکھا اور وظیفہ پڑھتے ہوئے آگے روانہ ہو گئے۔

اب میں نے ذرا زور سے کہا ۔" اگر آپ کو علم ہے تو حضرت ذرا سلیقہ بانو کے گھر کا پتہ بتا دیجئے "

یہ سن کر مولانا اس طرح ڈیڈ سٹاپ ہوئے جیسے بریک لگ گئی ہو۔ میری طرف آتے ہوئے بولے ۔" کیا فرمایا آپ نے کس کے گھر کا پتہ۔ سلیقہ بانو کا۔ آئیے میں چھوڑ آؤں۔ قریب ہی مکان ہے "

میں نے عرض کیا :۔ قبلہ آپ کو تکلیف ہوگی۔ راستہ بتا دیجیے۔ آپ تو پہلے ہی جلدی میں ہیں "

مولانا بولے :۔ نہیں صاحب جلدی اور تکلیف کاہے کی کسی کے کام آنا تو انسانی فرض ہے۔ آئیے آئیے میرے ساتھ آئیے "

میں نے اُن کو کچھ نہ بتایا کہ اصل میں کہاں جانا ہے۔ اُن کے ساتھ ہولیا۔ پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر گھر تھا۔ مولانا نے دو ایک سوال کیے، میں نے مناسب جواب دیا مولانا شاید مجھے سلیقہ بانو کا رشتہ دار سمجھ بیٹھے تھے۔ اس لیے شاید مجھے خوش کرنے کے لیے سلیقہ بانو کی تعریف شروع کر دی۔ اچھا گاتی ہیں۔ غزل، نعت، گیت، ادا اور خوب گاتی ہیں "

میں نے ہاں میں ہاں ملائی "بے شک بے شک۔ کیا بات ہے تمام چیزیں ایک ہی نے میں گاکر سنا دیں گی۔ کیا بات ہے کمال ہے"۔

مولانا بولے۔ "جی ہاں کیا بات ہے۔ سبحان اللہ۔ لیجیے یہ سامنے گھر ہے"۔

میں نے مولانا کا شکریہ ادا کیا اور سلیقہ بانو کے ساتھ والے مکان کا بورڈ پڑھنے لگا۔ "راجہ تصدق حسین جنجوعہ" بورڈ پر لکھا تھا۔ میں برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ مولانا چلّائے "ارے جی صاحب اِدھر اِدھر۔ یہ ہے گھر وہ نہیں"۔

میں نے مُڑ کر کہا "مولانا مجھے اسی گھر جانا ہے۔ یہ میرے عزیز ہیں سلیقہ بانو کا گھر تو بطور ثانی استعمال ہو رہا تھا"۔ مولانا نے مجھے گھورا۔ کچھ بڑبڑائے یا تو گالیاں دیتے یا وظیفہ پڑھتے ہوئے واپس چل دیے۔ اور مولانا کی کچھ ایسی بددعا لگی کہ دروازے پر ڈبل تالا علی گڑھ کا پڑا ہوا نظر آیا۔ میں تھک گیا تھا۔ سخت غصہ آیا۔ "اچھے ہیں یہ میاں بیوی۔ موٹر سائیکل کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جدھر مُنہ اُٹھتا ہے چل پڑتے ہیں"۔ میں پھر واپس چل پڑا۔ آتے آتے میں نے یہ بات ضرور محسوس کی کہ اکبر اور امرود کی جو حیثیت الہ آباد میں ہے وہی سلیقہ بانو کی حیثیت سیٹلائٹ ٹاؤن میں ہے۔

لامکان

اس شہر میں تبدیل ہو کر آئے ہوئے دو ماہ ہو گئے تھے مجھے مکان ملا تھا نہ انور کو۔ میں ایک سستے سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا لیکن سستے ہوٹل کا خرچ میری برداشت سے باہر تھا۔ انور ایک دور دراز کے رشتہ دار کے ہاں مقیم تھا جہاں وہ بھی تنگ تھا اور رشتہ دار بھی۔ آج کل کسی رشتہ دار کے ہاں ٹھہرنا آسان بات نہیں۔ دو ایک دن بعد رشتہ داروں کی بات چیت اور حرکات اس قسم کی ہوتی ہیں گویا کہہ رہی ہوں کہ آپ کسی اور جگہ بندوبست کیجیے اور ہماری جان چھوڑیے۔ انور اکثر رشتہ داروں کے متعلق ایک شعر ترنم کے ساتھ سنایا کرتا تھا۔

عجب سلگتی ہوئی لکڑیاں ہیں رشتہ دار
الگ ہوں تو دھواں دیں ملیں تو جلنے لگیں

میں اور انور چھٹی کے روز صبح سویرے مکان کی تلاش میں نکلتے اور شام کو ناکام واپس آجاتے اور پھر اگلے اتوار کے لیے مکان کی تلاش کا پروگرام بناتے۔

کسی بھلے زمانے میں اتنے مکان خالی ہوتے تھے کہ ہر تیسرے مکان پر ٹو لٹ، صاحب کا بورڈ ہوتا تھا۔ جنگ میں ٹو لٹ، صاحب ایسے شہید ہوئے کہ غریبوں پر مصیبت آگئی جہاں جاؤ صاف جواب ملتا ہے" اجی صاحب یہاں خالی مکان کہاں۔ آپ کو کس نے بہکا دیا۔ کوئی اور بات کیجیے۔ رہنے کے لیے جگہ چاہیے تو شہر سے باہر جاکر تلاش کیجیے"۔

جتنی جستجو ہم نے مکان کی کی تھی اگر بھولے سے خدا کی کرتے تو شاید مل جاتا اس بھاگ دوڑ اور تلاش کا فائدہ صرف اتنا ہوا کہ تمام شہر کی سڑکیں، محلے اور گلیاں زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ ہم شہر کے گائڈ کا کام بخوبی دے سکتے تھے۔

ایک دن دفتر میں کسی نے بتایا کہ فلاں محلے میں حاجی نور اللہ صاحب کا ایک مکان خالی ہے۔ شام کو میں اور انور دفتر سے اٹھ کر سیدھے حاجی نور اللہ صاحب کے در دولت پر حاضر ہوئے۔ ہمیں ایک کمرے میں حاجی صاحب کا انتظار کرنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔ آدھ گھنٹے بعد حاجی صاحب تشریف لائے۔ شکل و صورت نورانی سفید داڑھی۔ لباس بالکل حاجیوں جیسا تھا۔ ہم نے مدعا عرض کیا کہ مکان کرایہ پر لینا چاہتے ہیں۔ حاجی صاحب ہم دونوں کو سر سے پاؤں تک بہت بری طرح سے گھورنے لگے۔ جیسے ہم دونوں نے اُن کی اکلوتی لڑکی کا مشترکہ رشتہ مانگ لیا ہو حاجی نور اللہ صاحب کے اس طرح گھورنے سے ہم گھبرا گئے۔

حاجی صاحب اچانک چلائے۔ "کیا ملتا ہے آپ کو؟"

کچھ جان میں جان آئی۔ لیکن ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ "دونوں کو تین سو روپیہ ماہوار۔"

دونوں کی تنخواہ اس لیے اکٹھی بتائی تاکہ معقول نظر آئے۔

حاجی صاحب پھر غرائے۔ "اگر مکان کرائے پر لیا تو پھر کھاؤ گے کیا؟"

"کیا بہت کرایہ ہے مکان کا؟" انور نے پوچھا۔

"ہاں بہت بڑا پکا مکان ہے۔ آٹھ دس کمرے ہیں اور کرایہ چار سو روپیہ ماہوار۔ وہ دیکھو سامنے سفید بلڈنگ۔" حاجی صاحب دروازے میں سے اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

انور کہنے لگا آپ کرایہ کا فکر نہ کریں ہم چار سو روپیہ ماہوار ہی دے دیں گے۔"

حاجی صاحب ماتھے پر لہریں ڈالتے ہوئے بولے "وہ کیسے۔ تنخواہ تو ہے صرف تین سو روپے۔ چار سو کہاں سے دو گے؟"

انور مسکرا کر بولا۔ "ہم سو آدمی مل کر دے لیں گے۔ ہر ایک کے حصہ میں چار چار روپیہ پڑے گا۔"

حاجی نوراللہ صاحب چڑ کر چیخے "میں مکان کرایہ پہ دیتا ہوں ہسپتال نہیں۔ معاف کیجیے۔"

ہم دونوں حاجی صاحب کو معاف کر کے باہر آئے۔ سامنے بلڈنگ پر نگاہ کی۔ اچھی شاندار عمارت تھی۔ بلڈنگ کی پیشانی پر اس کا پتا نام لکھا ہوا تھا "رام نواس"۔

انور ہنس کر بولا "لاحول ولا قوۃ! کرایہ چار سو اور خود بیس قدم آگے۔"

ایک اور جگہ گئے۔ مالک مکان بہت شریف اور طبیعت کا نرم نکلا۔ لیکن مکان کام کا نہ تھا۔ مکان کیا تھا۔ صرف ایک کمرہ۔ وہ بھی صحن عبور کر کے اندر کافی دور جا کر۔ دن کے وقت بھی کمرے میں سخت اندھیرا تھا۔ بتی جلانے کی ضرورت پڑتی تھی۔

مالک مکان کمرہ دکھا کر باہر ہم کو سڑک پر لے آئے اور بولے۔ بہت ٹھنڈا اور سستا کمرہ ہے۔ صرف پندرہ روپے ماہوار۔ اس میں پانی بھی شامل ہے اور دیگر جتنے لوگ کمروں میں رہتے ہیں سب شریف ہیں۔

انور کہنے لگا "آپ نے فرمایا تھا بجلی پانی سب موجود ہے۔ ہم کو سوائے بجلی کے ایک بلب کے پانی کا کہیں نام و نشان تک نظر نہ آیا اور نہ لیٹرین کا کوئی بندوبست ہے۔"

مالک مکان صاحب سڑک کے پار دور ٹین کی ایک کالی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "بندہ پرور دیکھیے سامنے یوڑین کی لیٹرین ہیں کمیٹی کی۔ یہ سب آپ کے لیے ہیں۔ جب چاہیں جتنی چاہیں اور جتنی دیر تک چاہیں استعمال کریں۔ نہ جمعدار رکھنے کی ضرورت نہ اس سے کچھ دینے سے واسطہ۔ باقی رہا پانی تو دیکھیے یہ دروازے کے ساتھ کمیٹی کا نل ہے۔ دن بھر نہایئے کوئی پوچھنے والا نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "پندرہ روپیہ میں وہ مفت کا پانی کونسا ہے؟"

مالک مکان فرمانے لگے۔ "کرایہ پندرہ روپیہ ہے پانی مفت سمجھیں یا نہ سمجھیں یہ آپ کی مرضی۔"

یہاں یورینل لیٹرین اور باتھ روم یعنی پانی کا نل تو بہت پسند آئے لیکن کمرہ رہنے کے قابل نہ تھا اس لیے یہاں سے محروم لوٹے۔

چند دن بعد پھر ایک مکان کی اطلاع ملی۔ وہاں پہنچے تو مالک مکان نے ایک گیراج کھول دیا۔

میں نے عرض کیا۔ "جناب ہمیں رہنے کے لیے کمرہ چاہیے۔ موٹر کے لیے گیراج کی ضرورت نہیں۔ آپ شاید غلط سمجھے ہیں۔"

انھوں نے فرمایا۔ "صاحب لاجواب جگہ ہے۔ گیراج کا گیراج۔ کمرے کا کمرہ۔ چاہے خود رہو۔ موٹر رکھو۔ گائے رکھو یا بیل باندھو۔ کتنے فائدے ہیں۔ مگر کرایہ صرف بیس روپیہ ماہوار۔ باقی رہا پورا مکان اپنا بنوا لیں تو یہ دوسری بات ہے ورنہ تمام شہر میں ملنا ناممکن بات ہے۔"

اب نہ تو ہمارے پاس کار تھی نہ گائے۔ بیل کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ خود بندھ سکتے تھے مگر فی الحال ارادہ نہ تھا۔

ایک جگہ کمرہ بہت اچھا نظر آیا۔ ہوادار۔ بجلی پانی موجود۔ چھوٹا سا باتھ روم مگر

کرایہ مالک مکان کے الفاظ میں "صرف" سو روپیہ ماہوار تھا۔

انور نے حیرت سے مالک مکان کی طرف دیکھ کر کہا: "مہربانی فرما کر کرایہ بتائیے ہم کمرہ خریدنا نہیں چاہتے۔ آپ نے شاید کمرے کی قیمت بتا دی ہے۔"

وہ حضرت چڑ کر بولے: "مہربانی فرما کر کمرے کا کرایہ بتایا ہے۔ اس سے کم کرایہ کا ایسا کمرہ ملے تو جا کر لے لیجیے یہاں تو یہی حساب ہے۔"

اس جگہ بھی فارغ ہوئے۔ گلی کے موڑ پر آئے تو ایک دودھ دہی بیچنے والا پہلوان ہمیں دیکھ کر بولا: "بابو جی مکان ڈھونڈ رہے ہو بھلا مکان اس ملک میں کہاں۔ آج کل رشتہ ملنا آسان ہے مگر مکان ملنا بہت مشکل ہے۔"

انور نے جواب دیا: "پہلوان آخر بیوی کو بھی مکان میں رکھنا ہے، ساتھ لے کر مکان کی تلاش تو نہیں کرنی۔"

پہلوان ہنس کر بولا: "ٹھیک ہے بابو صاحب لیکن کیا کریں یہ سب محکمہ بھر سے لاؤ، کا کرشمہ ہے۔ کہیں تو ایک ایک کمرے میں چار چار خاندان ہیں کہیں بڑے سے مکان میں صرف ایک آدمی۔ لیکن بابو صاحب ایک مکان میرے نظر میں ہے اچھا کھلا، ہوادار۔ بجلی پانی سب حاضر، چار کمرے جس کے پاس ہے وہ تبدیل ہو کر کہیں جا رہا ہے۔ اور کرایہ صرف بیس روپیہ مہینہ۔"

اتنا کم کرایہ اور پورا مکان۔ ہم اس کو قابو کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

پہلوان سے کہا: "اچھا بھئی دکھاؤ تو وہ مکان۔ اگر بندوبست ہو گیا تو تمہارے پان سگریٹ کا انتظام کر دیں گے۔"

مکان دیکھا بہت پسند آیا اچھا صاف ستھرا الاٹ ہو چکا تھا جس کے پاس تھا وہ تبدیل ہو کر باہر جا رہے تھے۔

کہنے لگے: "مجھے یہ مکان الاٹ ہوا ہے۔ صرف بیس روپیہ ماہوار کرایہ ہے۔

ڈی سی آر یسی الاٹ کرتا ہے مکان کا قبضہ آپ کو میں دے دوں گا۔ الاٹ آپ خود کرالیں۔

اس شریف انسان سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ اللہ کا شکر ادا کرتے کو جی چاہنے لگا جس نے خود بخود مکان کا بندوبست فرما دیا۔

انور نے اپنی خوشی چھپاتے ہوئے پوچھا: "فرمائیے قبضہ کے لیے کب حاضر ہو جائیں؟"

وہ حضرت کہنے لگے: "یہ آپ پر منحصر ہے جب اور جس وقت آپ مجھ سے فیصلہ کر لیں"۔

"فیصلہ! وہ کس بات کا" میں نے پوچھا۔

پہلوان صاحب اب بیچ میں کود پڑے: "بابو جی۔ بالکل سیدھی بات ہے مکان ملنا کونسی آسان بات ہے۔ ان کے پاس بہت سے لوگ آئے ہیں بڑھ چڑھ کر پگڑی کی بولی دے گئے ہیں۔ اب آپ بتائیں فیصلہ ہو جائے گا"۔

میں نے مایوسی کے عالم میں پوچھا "کہاں تک بولی ہو چکی ہے"۔

پہلوان صاحب نے کہا: "آخری بولی چھ سو کی ہے"۔

میں اور انور ایک دوسرے کی طرف گھبرا کر دیکھنے لگے جیسے مکان ہم پر گر گیا ہو۔

انور نے کہا: "نہیں صاحب یہ تو ہمارے بس کی بات نہیں۔ چھ سو تو پورے سوٹ کی بولی نظر آتی ہے، پگڑی کی نہیں"۔

ایک جگہ تو مکان ملتے ملتے رہ گیا۔ جب سب کچھ طے ہو گیا تو اچانک مالک مکان نے سوال کر دیا: "آپ شادی شدہ تو ضرور ہوں گے؟"

بدقسمتی سے ہم دونوں میں سے کسی کی شادی نہ ہوئی تھی۔ ہم نے سوچا اگر آئندہ کہیں ایسا سوال ہوا تو انور کو شادی شدہ ظاہر کیا جائے گا۔ کسی نہ کسی طرح مکان تو قابو کیا جائے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔ غرضیکہ بڑی دقت اور دھکے کھانے کے بعد ایک تین کمرے کا مکان چالیس روپے ماہوار پر مل گیا۔ شرط یہی تھی کہ جلد سے جلد بیوی کو بلوا لیا جائے کیونکہ یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ شرافت کا یہ معیار اسی محلہ میں آکر معلوم

ہوا۔ اور بعد میں دیکھا تو شرافت کی یہی کسوٹی تھی۔

چند دن تو ہم اسی سوچ میں رہے کہ اب بیوی کا کیا بندوبست کیا جائے اور کہاں سے لائی جائے۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر بہت سوچنے کے بعد ایک عارضی تجویز ذہن میں آگئی۔ ایک دن شام کو دفتر سے آکر تمام محلہ میں لڈو بانٹ دیئے اور مالک مکان صاحب کے گھر ایک بڑی ٹوکری موتی چور لڈوؤں کی بھیج دی اور ظاہر یہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے انور صاحب کو ایک صاحبزادہ فرزند ارجمند عطا فرمایا ہے۔ اسی کے متعلق تار آج دفتر میں موصول ہوا تھا۔ محلہ والوں نے بہت مبارک باد پیش کی اور سب سے زیادہ مالک مکان صاحب نے۔

چلو دو ایک ماہ کے لیے آرام ہوا باقی پھر دیکھا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ خود کوئی بندوبست کریں گے۔ لیکن اس عرصہ میں ہم نے شرافت کا ایسا مظاہرہ کیا کہ مالک مکان صاحب ہم سے بہت خوش تھے اور ہر جگہ ہماری تعریف کرتے تھے کہ بہت نیک لڑکے ہیں۔ محلہ میں نیچی نظر سے چلتے ہیں۔ کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اصل میں ہم مہینے میں دو ایک بار کبھی آم کبھی انگور یا سیب بازار سے خرید کر مالک مکان صاحب کے گھر بھجوا دیتے تھے۔ اور ساتھ کہلا بھیجتے کہ اپنے باغ کا پھل گھر والوں نے بھیجا ہے اور یہ آپ کا حصہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آج تک ہم اس مکان میں ہیں۔

چچا نصیحت خاں وصیت کا آخری خط

میرے عزیز بچو میرا پورا نام میرزا نصیحت خاں قریشی ہے اور تخلص وصیت ہے۔ میرے بچو تم ضرور حیران ہو گئے کہ چچا ایک وقت میرزا خاں اور قریشی کیسے بن گئے۔ تو سنو یہ ایک معمولی سی بات ہے۔ والد کی طرف سے میں میرزا ہوں اور والدہ قریشی تھیں۔ اس طرح میرزا اور قریشی تو میں خاندانی ہوں اور خاں میں خود بن گیا۔ باپ نے مجھے میرزا بنایا ماں نے قریشی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں خود کچھ نہ بنتا۔ لہٰذا خان بن گیا اور جن لوگوں کے سامنے بنا تھا وہ اب بھی موجود ہیں اور بطور گواہ پیش ہو سکتے ہیں۔

میرے عزیزو میری عمر اس وقت ایک کم ایک سو سولہ سال ہے۔ میں نے بہت سے زمانے دیکھے ہیں یا یوں سمجھ لو کہ بہت سے زمانوں نے مجھے دیکھا ہے۔ زمانے بدل گئے مگر میں ویسے کا ویسا ہی ہوں۔ میری صحت بہت اچھی ہے۔ پرانے زمانے کا کھایا ہوا خالص گھی اب کام آرہا ہے۔

بہرکیف میں تم کو یہ آخری خط لکھ رہا ہوں۔ جو کچھ اس میں لکھا ہے اس پہ عمل کرنا جب تک میں زندہ ہوں اس کو میری نصیحت سمجھنا اور میرے مرنے کے بعد وصیت۔ اس کو آخری خط اس لیے نہ سمجھنا کہ چچا ایک کم ایک سو سولہ سال کا ہے۔ اور چل چلاؤ کا وقت ہے بلکہ اس کو آخری خط میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ سال تم میں سے بہت سوں کو میں نہ دیکھ سکوں۔ یہ یقین مجھ کو تمہاری ناقص غذا اور بناسپتی صحت کے سبب ہے ورنہ میرا ذاتی ارادہ تو ابھی کم از کم سو سال

اور زندہ رہنے کا ہے۔ اس خط میں میری تمام عمر کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔ اس دنیا میں اگر آرام اور چین سے رہنا چاہتے ہو تو میرے لکھے پر عمل کرنا مزے میں رہو گے۔

میرے بچو! جو شخص تم سے بڑی نرمی اور خوش اخلاقی سے پیش آئے تو اس سے ڈر کر رہنا۔ ایسے شخص میں خطرے کی "ہارس پاور" بہت زیادہ ہوتی ہے اور وہ دل کا اچھا نہیں ہوتا اور جس شخص کا برتاؤ سختی کا ہو اس سے مت گھبرانا۔ وہ زبان کا سخت ہو گا مگر دل کا اچھا ہو گا۔ اور وقت پر ہمیشہ کام آئے گا۔

عزیزو جب کوئی تمہارا دوست تمہارے پاس بے وقت اور مسکین صورت بنا کر آئے تو سمجھ لینا کہ ضرور قرضہ مانگنے آیا ہے۔ ہمت کر کے انکار کر دینا۔ اگر ہمت جواب دے جائے تو ٹرخانے کی کوشش کرنا اور اگر ٹرخانے میں بھی فیل ہو جاؤ تو جتنی رقم مانگتا ہو اس سے بہت کم دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بھول جانا۔ وہ محاورا تم کو ضرور یاد ہو گا جب ایک شخص کو اس کی قرضہ کی رقم واپس نہ ملی تو مرتے وقت وہ کہہ گیا تھا۔ "قرضہ دے دریا میں ڈال" ...... اور جب کبھی کسی دوست سے تنگ آ جاؤ اور اس سے جان چھڑانا چاہو تو اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی نیکی کر دینا یا اس کو زیادہ سی قرضہ دے دینا۔ پھر وہ تمہارے پاس بھول کر بھی نہ آئے گا۔

لیکن جب کوئی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ تمہارے پیچھے بغیر ہاتھ دھوئے پڑ جائے تو اس سے بچنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ چپکے سے بیمہ کرا لو۔ پھر وہ کبھی بھی تمہارے پاس نہ آئے گا۔

میرے عزیز بھتیجو! وقت کا ہمیشہ خیال رکھنا۔ دفتر ہمیشہ وقت پر پہنچنا۔ کبھی دیر سے نہ جانا۔ چاہے تمہارا افسر روزانہ دیر سے دفتر آتا ہو۔ یاد رکھو جس دن تم دیر سے دفتر جاؤ گے وہ وقت پر آ جائے گا۔ اس لیے افسر کی پیروی نہ کرنا۔

جب کبھی گھڑی، ریڈیو یا مشینری کی قسم کی کوئی چیز خراب ہو جائے تو صبر کر لینا

اس چیز کو چھنک دینا کبھی مستری کو مت دینا۔ اگر کسی مستری کے ہتھے چڑھ گئی تو ساری عمر اس کی مرمت ہی ہوتی رہے گی۔ ایک نقص اگر مستری دور کر دے گا تو دوسرا اپنے روزگار کے لیے پیدا کر دے گا۔ تمہاری چیز دوران تمہارے پاس رہے گی اور تین دن مستری کے پاس اور اس کا ایسا ہی حال ہو گا جیسا انسان کا خیراتی ہسپتال میں ہوتا ہے کہ ہمیشہ کے لیے وہیں کا ہو رہتا ہے۔ ایک بیماری سے نجات ملتی ہے تو دوسری پیدا ہو جاتی ہے بس آدمی تمام عمر اور ہال اور مرمت ہی ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ ناقابل استعمال بن جائے۔

انتہائی کوشش کرنا کہ کبھی عدالت میں نہ جانا پڑے اور اگر جانے پر مجبور ہو جاؤ تو کوشش کرنا کہ بطور ملزم کے جاؤ۔ لیکن شہادت کی نوبت نہ آنے پائے۔ عدالت کی شہادت سے شہید کا رتبہ نہیں ملتا اور ہاں یاد رکھو کہ عدالت جاتے وقت گھر سے دری یا کرسی منگوا لے جانا وہاں بیٹھنے کا کوئی انتظام نہیں۔ البتہ کھڑے ہونے کا بندوبست مکمل ہے اور کھڑے کھڑے انسان ایک ٹانگ کا مرغا بن جاتا ہے۔

اے عزیزو جب کبھی مسجد میں جانے کا اتفاق ہو تو ننگے پاؤں جانا۔ اور اگر ہمت نہ کر سکو تو کوئی پرانی پھٹی جوتی پہن کر جانا۔ اگر نئی جوتی پہن کر جاؤ گے تو یاد رکھو ننگے پاؤں واپس آؤ گے پھر نئی جوتی کبھی نظر نہ آئے گی۔ البتہ اس کے اجر کی امید رکھ سکتے ہو۔

اے میرے عقلمند بھتیجو! اگر اپنے گھر میں آرام اور چین سے رہنا چاہتے ہو تو اپنی بیویوں سے جھوٹ اور سچ ریت اور ممیمنٹ کے سرکاری نرخ سب سے بولنا۔

اپنے دوستوں کا دل کبھی نہ توڑنا۔ اگر کبھی تمہارا کوئی دوست تم سے کوئی کتاب پڑھنے کے لیے مانگے تو اس کو کتاب کی قیمت دے دینا تاکہ بازار سے خرید کر پڑھ لے کتاب ہرگز نہ دینا۔ وہ تم سے کتاب یہ کہہ کر لے جانا چاہے گا۔ کہ "میں دوسروں کی طرح نہیں جو کتاب لے جا کر واپس نہیں کرتے" اگر تم نے کتاب دے دی تو سمجھو کتاب گئی۔

اے پیارے بچو! میری اس بات کو گرہ میں باندھ لو کہ جب تک تم کسی بڑے آدمی کے داماد یا سالے نہ بن سکو تو کسی بڑی نوکری کے لیے کسی بورڈ کے سامنے پیش نہ ہونا۔ خواہ چورن بیچ کر گزارہ کرنا پڑے۔

اگر شریف آدمی کو خراب کرنے کی نیت ہو تو اُس کو نیک صلاح دے کر کمیٹی کے الیکشن کے لیے کھڑا کر دینا۔ یاد رکھو یہ تدبیر کبھی خطا نہیں ہوتی اور تم پھر بھی ہمسایہ بنے رہو گے۔

دولت حاصل کرنے کے لیے معمہ بازی کی طرف بھول کر رجوع نہ کرنا جتنی معمہ کی فیس ہو اُس کے پھل کھا لینا فائدے میں رہو گے۔ یہ سچ ہے کہ اللہ چھپر پھاڑ کر دولت دیتا ہے لیکن یہ بھی یاد رکھو کہ چھپر تمہارا پھٹ جائے گا مگر دولت کسی اور کو مل جائے گی۔

یہ بات بھی پلے باندھ لو کہ ہر چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے بھی بنا کر رکھنا کچھ پتہ نہیں کس وقت وہ اچانک بڑا آدمی بشکل وزیر بن جائے اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ کہ اس سے بنا کر کیوں نہ رکھی۔

اے نیک بچو! اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو دل کھول کر بلیک کرنا لاکھوں کے حساب سے اور بڑی چیز کی کرنا مثلاً اونٹ کی۔ کبھی پکڑے نہ جاؤ گے کیونکہ اونٹ پکڑنے والے ہاتھ تھاب نہیں ہوتے۔ سگریٹ کی ڈبیا یا پان بیڑی کی بلیک مارکٹ نہ کرنا فوراً دھر لیے جاؤ گے۔ یہ چیزیں آسانی سے ہاتھ میں آجاتی ہیں۔ اور حج کرنے ضرور جانا اور جہاں پر لبیک کہنے کا موقع آئے تو تم بلیک کہنا اللہ برکت دے گا۔

فقط۔ تمہارا چچا مرزا النصیحت قریشی وصیت

روزی ڈارلنگ

روزی کی خوبصورتی کی کیا بات تھی ایسی خوبصورتی کبھی کبھی دیکھنے میں آتی ہے متناسب ناک نقشہ۔ رنگ میدہ و شہاب، آنکھیں نشیلی اور سحر طراز۔ نظر پڑتے ہی دل کھنچنے لگتا۔ دل تو میرا بھی اکثر چاہتا تھا کہ اگر کوئی دیکھنے والا نہ ہو تو روزی ڈارلنگ کو اپنے کلیجے میں بٹھا لوں اور بعض اوقات مجھے موقع بھی ملا۔ مگر میں حقیقت میں روزی سے ڈرتا تھا کمبخت کے دانت جتنے خوبصورت تھے اتنے ہی تیز بھی تھے۔ تمام گھر والوں کے حد سے زیادہ لاڈ پیار نے اس تیزی پر اور پانی چڑھا دیا تھا۔

اکثر گھروں میں کچھ نہ کچھ شوق ہوتا ہے۔ کوئی گائے بھینس پال لیتا ہے تاکہ دودھ مکھن گھی کا آرام رہے۔ جسے کم توفیق ہے وہ بکری پر قناعت کر لیتا ہے جو یہ بھی نہ کر سکے کبوتر اڑا کر خوش رہتا ہے۔ بٹیروں سے جی بہلا لیتا ہے لیکن نو دولتیے گھروں میں جو ہوبی ہوتی ہے دکھاوے کی ہوتی ہے۔ یہ لوگ نئی کاروں کے دیوانے ہوتے ہیں اور کتے پال لیتے ہیں۔ خود چائے پر گزارہ کر لیتے ہیں اور کتوں کو دودھ پلاتے ہیں۔ خود سن باتھ لیتے ہیں لیکن لاڈلے کتے کو صابن مل کر گرم پانی سے نہلاتے ہیں۔ کتے پالنے کا یہ جواز پیش کیا جاتا ہے کہ گھر کی رکھوالی کرتا ہے۔ چور تو ایک طرف کوئی شریف انسان بھی بے دھڑک کوٹھی میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کتے کی وجہ سے اہل خانہ کو ہر آنے جانے والے کا علم رہتا ہے لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ چوریاں اکثر ان گھروں میں ہوتی ہیں جہاں کتے حفاظت کے لیے ہوتے ہیں جب چوری کی واردات

ہوتی ہے تو یہ کتے اس طرح منہ پھیر لیتے ہیں جیسے رشوت کھا چکے ہوں۔

روزی ڈارلنگ بیگم صاحبہ کے گھر کی محافظ تھی۔ شروع شروع جب وہ آئی تو روزی کہلاتی تھی۔ آہستہ آہستہ لڑکیوں نے روزی ڈارلنگ کہنا شروع کر دیا۔ اب یہی اس کا نام ہو گیا۔ ہر چھوٹا بڑا اس کو روزی ڈارلنگ کے نام سے پکارتا تو وہ اسے عجیب نظروں سے دیکھتی تھی۔ گھر کا ہر فرد مبالغہ کے ساتھ روزی ڈارلنگ کی تعریف کرتا تھا۔ بڑے لوگ خاص کر نو دولتیوں کو شاید مبالغے کے انجکشن لگے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ جو بھی بات کرتے ہیں اس میں مبالغہ ہوتا ہے اور اصلیت سے دور ہوتی ہے۔ بات کم اور گپ زیادہ نظر آتی ہے۔ اگر کسی بڑے آدمی میں یہ بات نہ ہو تو سمجھ لیجیے کہ وہ خاندانی ہے نئے سٹاک میں سے نہیں۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ میں روزی ڈارلنگ سے ڈرتا تھا اسی وجہ سے میں بیگم صاحبہ کے گھر جانے سے احتراز کرتا۔ بیگم صاحبہ رشتے میں میری چچا زاد بہن تھیں کیونکہ اب وہ بڑے لوگ ہو گئے تھے ان کے پاس کار بھی تھی اور روزی ڈارلنگ بھی تھی اس لیے رشتہ ذرا دور کا ہو گیا تھا میں اُن کو آپا کہنے کے بجائے ملازموں کی طرح بیگم صاحب کہا کرتا تھا جس کو وہ زیادہ پسند کرتی تھیں۔

بیگم صاحبہ کے ہاں جب کبھی جاتا روزی ڈارلنگ میرے لیے عذاب جان بن جاتی تھی۔ میرا استقبال اس پُر جوش طریقہ سے بے ردیف و بے قافیہ شعروں میں کرتی تھی۔ نئی سے نئی غزل بغیر سانس لیے سُنا جاتی تھی۔ روزی ڈارلنگ کو جتنا شاعری کا زبانی شوق تھا۔ ترقی یافتہ گھر میں تھی۔ ماحول کا اثر ہونا ضروری تھا میں ایسی شاعری سے قطعی ناواقف۔ اور پھر ڈر کی وجہ سے داد نہ دے سکتا تھا۔ لیکن وہ ستم گر زبردستی داد وصول کرتی تھی۔ عجیب دل ربایانہ انداز سے اُچھلنے کودنے اور گلے کا ہار ہونے کی کوشش کرتی۔ اور دھوبی کے دُھلے ہوئے سوٹ پر جو بیگم

صاحبہ کے ہاں پہلی بار پہن کر آتا، ہمیں پنجوں سے حملہ آور ہوتی۔ میں ڈرتا کہ اب کوٹ پھٹا یا پتلون گئی۔ نئے نئے مورچے بنا کر حملہ کرتی کہ میں بدحواس ہو جاتا۔ اس وقت واقعی مجھے خدا یاد آ جاتا اور میں دل میں عہد کر لیتا کہ آج سے نماز شروع کر دوں گا خدا بھلا کرے بیگم صاحبہ کا۔ ایسے نازک موقع پر مددگار ہو جاتی تھیں۔ روزی ڈارلنگ کو انگریزی میں اپنے پاس بلا کر اس کی نرم و نازک پیٹھ پر نرم و نازک ہاتھ پھیرتی تھیں، اور میری طرف سے اس کے شعروں کی داد دے کر اس کی تشفی کرتی تھیں۔ تب کہیں جا کر میری جان بچتی تھی۔ اور میں فوراً بھول جاتا تھا کہ میں نے ابھی ابھی نماز پڑھنے کا عہد کیا ہے مشہور ہے کہ کتے جس کو ایک بار دیکھ لیتے ہیں اس کو مشکل سے بھولتے ہیں دوبارہ اس کے آنے پر پہلے جیسا سلوک نہیں کرتے لیکن روزی ڈارلنگ ہر ملاقات پر ایک جیسا ہی سلوک کرتی تھی یقیناً اس کا حافظہ کمزور تھا۔ آخر تھی بھی تو بڑے آدمیوں کی۔

ایک دن بیگم صاحبہ سے عرض کر دیا: "یہ کیا مصیبت ہے۔ میرے تو اکلوتے سوٹ کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ میں اب یہاں لنگوٹی ہی پہن کر آیا کروں گا۔"

بیگم صاحبہ ہنس کر کہنے لگیں: "یہ تم سے پیار کرتی ہے۔"

عرض کیا: "تو مجھے پیار کرنے کے لیے کتے بلیاں اور ترسے جانور ہی رہ گئے ہیں اور پھر یہ پیار کرنے کا کیا طریقہ ہے جیسے کوئی تھانیدار محبت کر رہا ہو۔"

بیگم صاحبہ ہنس کر بولیں: "روزی ڈارلنگ بہت خوبصورت اور پیاری ہے۔ بھیڑیے جیسی شکل ہے اور چوکیداری بھی خوب کرتی ہے۔ کیا مجال کوئی غیر آدمی کوٹھی میں قدم رکھ سکے۔"

میں نے کہا: "بہت خوب، مگر آپ کو کس نے بہکا دیا کہ بھیڑیا خوبصورت ہوتا ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ جب چور آتے ہیں تو کتے اور چوکیدار خواب خرگوش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ روزی ڈارلنگ کو کسی آم کے پیڑ سے باندھ کر رکھیے، مجھے

یہاں آنے میں سخت دقت ہوتی ہے۔ ویسے بھی ماشاءاللہ یہ اب جوان ہو گئی ہے۔ اس کی شادی کر کے رخصت کیجیے۔

بیگم صاحبہ ہنسنے لگیں۔ پھر ٹھہر کر بولیں "واہ ہم تو سوچ رہے تھے کہ جب اس کے بچے ہوں گے تو ایک خوبصورت سا بچہ تم کو بھی دیں گے"

میں نے عرض کیا "اس کا مطلب ہے کہ جو ایک آدھ شخص میرے گھر آتا ہے وہ بھی آنا چھوڑ دے اور پھر میرا تو آپ کے ہاں آنا بالکل ناممکن ہو جائے گا"

بیگم صاحبہ نے پوچھا "وہ کیسے؟"

ادب سے عرض کیا "جب روزی ڈارلنگ نے "بابا لوگ" دیئے تو آپ کی کوٹھی میں اندر باہر اوپر نیچے چاروں طرف، روزیاں ہی روزیاں ہو جائیں گی۔ اور یہاں چوبیس گھنٹے تقریبیں ہوں گی۔ ہر وقت مشاعرہ گرم رہے گا۔ اب اس وقت مجھ سے ایک کو داد نہیں دی جاتی۔ اس وقت کیا حالت ہو گی جب شعروں کی موسلا دھار بارش ہونے لگے گی اور اردگرد کی کوٹھیوں میں چوری کا خطرہ نہیں رہے گا۔ میں تو اس سڑک کا رخ ہی چھوڑ دوں گا"

بیگم صاحبہ خوب ہنسیں اس کے بعد بہت دیر تک روزی ڈارلنگ، کی شان میں قصیدہ خوانی کرتی رہیں "یہ روزی ڈارلنگ" تو بہت نیک ہے۔ سمجھدار ہے۔ صبح جب رفعت سکول جانے لگتی ہے تو بس تک چھوڑنے جاتی ہے اور بارہ بجے کے قریب بس کے آنے کے وقت گیٹ پر جا بیٹھتی ہے اور اگر بس کو دیر ہو جائے تو بیقرار ہو جاتی ہے"

میں نے شرارت سے کہا "یہ کیا بات ہے اپنے وقت کی نور جہاں ہے اور پھر گانے بھی لگتی ہے۔

دل میں ہیں بے قراریاں آنکھوں میں انتظار ہے

بیگم صاحبہ ہنستے ہوئے بولیں "تم بہت شریر ہو لیکن تم اس سے ڈرا نہ کرو۔ یہ تو بچوں کے ساتھ خوب کھیلتی ہے۔ عفت گیند پھینکتی ہے تو یہ اٹھا لاتی ہے۔ ہر ایک کا حکم مانتی ہے۔ کل کی بات ہے میجر شیخ کی چھوٹی لڑکی اپنا رومال یہاں بھول گئی تھی۔ یہ منہ میں پکڑ کر ان کے گھر چھوڑ آئی۔ جوتوں کی اس کو بہت پہچان ہے۔ عشرت اگر کہتی ہے روزی ڈارلنگ میرا سرخ سینڈل لاؤ تو سرخ سینڈل ہی لائے گی اور کیا مجال کہ عفت یا رفعت کا جوتا لے آئے۔"

یہ قصیدہ سن کر جی چاہتا تھا کہ نعرۂ تکبیر بلند کروں لیکن بیگم صاحبہ کے سوا اور بہت تھی۔ پھر بھی اتنا عرض کر دیا "آپ اس کو باٹا شو شاپ میں نوکر کرا دیجئے سیل مین کے فرائض بخوبی انجام دے گی۔"

بیگم صاحبہ ہنسنے لگیں۔

شروع سردی کے دن تھے۔ کوٹھی کی مرمت ہو رہی تھی۔ بہت سے مزدور روز صبح سے شام جمع رہتے تھے۔ اتفاق کی بات رات کو کہیں روزی ڈارلنگ کو ہوا لگ گئی۔ صبح دیکھا تو سست سی تھی۔ وہ چستی تھی نہ چالاکی۔ تمام گھر پریشان۔ فوراً ڈاکٹر کو فون کیا گیا۔ وہ بے چارا بھاگا ہوا آیا۔ اور معائنہ کے بعد فرمایا کہ "بے چاری کو ہوا لگ گئی ہے نمونیہ کا اثر ہے اور دل بھی کمزور ہے اسے فوراً گرم دودھ گلوکوز ڈال کر پلایا جائے اور دوائی میں ہسپتال جا کر بھیجدوں گا۔"

تینوں لڑکیوں نے مل کر روزی ڈارلنگ کی چھوٹی سی چارپائی پر چارپائی ریشم کا گدا درست کیا اور اسے بڑے پیار سے لٹا دیا۔ تمام گھر والے ارد گرد کھڑے ہو کر مشورہ کرنے لگے۔ میں صحن میں بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ مزدور لوگ روزی کی اتنی خدمت ہوتی دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ رفعت نے گرم دودھ برتن میں ڈالا عفت گلوکوز ڈالی ڈال کر چمچہ ہلاتے لگی۔ عشرت نے برتن روزی ڈارلنگ کے آگے کر کے دودھ پلانا شروع

کیا بیگم صاحبہ خود کھڑی سپروائز کر رہی تھیں،

چار دن گزر گئے، مگر روزی ڈارلنگ کی حالت میں کچھ تغیر نہ ہوا۔ ڈاکٹر صبح اور شام آتا اور تمام گھر کو تسلی دیتا۔ اپنی فیس کھری کرتا اور چلا جاتا۔

عشرت کہتی "امی روزی ڈارلنگ کھانستی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کھانسی کا بھی بندوبست کیجیے"۔

ایک کتے کی بچی بیمار اور حضرت آدم علیہ السلام کا تمام کنبہ اس کی خدمت کے لیے ہر وقت حاضر اور کمربند۔

ہزاروں تدابیر اختیار کی گئیں مگر افسوس روزی ڈارلنگ بے چاری چھٹے روز صبح کے وقت داغ مفارقت دے گئی۔

بڑے آدمیوں کی روزی تھی۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ اصولاً بیچاری کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

عشرت کہنے لگی "امی صبح ہی صبح اٹھی تھی اور دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی تھی"۔

رفعت بولی "پانی مانگتی ہو گی"۔

بیگم صاحبہ نے غمگین آواز میں کہا "آہ بے چاری پیاسی مر گئی"۔

روزی ڈارلنگ کی موت کو خاصہ عرصہ گزر چکا ہے۔ بیگم صاحبہ کے ہاں اب میں بغیر کبھی ڈر کے جاتا ہوں۔ جب کبھی روزی ڈارلنگ کا ذکر آتا ہے ..... تو خان بہادر صاحب مذاقاً کہا کرتے ہیں اسے تو کسی کی نظر کھا گئی۔

حکیم نون محمد

صاحبان! حکیم نون محمد صاحب اپنے ذاتی الفاظ کے مطابق نہ ڈاکٹر ہیں نہ حکیم بد قسمتی سے ہومیو پیتھ بھی نہیں۔ بلکہ آپ دفتر میں کلرک تھے اور کلرک سے ترقی کر کے سیدھے افسر بن گئے۔ حکیم جی نے حکیم نہ ہونے کے باوجود فارسی زبان میں کچھ ریختہ قسم کے الفاظ میں چند نسخے زبانی یاد کر لیے ہیں اور یہی اُن کے حکیم ہونے کی سند ہے۔

عام روایت یہ ہے کہ پاکستان میں آنے کے بعد اُن کو کسی وید جی مہاراج یا کبیراج کا گھر الاٹ ہو گیا۔ اور گھر میں اُن کو دو بڑی بڑی کتابیں فارسی زبان میں مل گئیں۔ ان کتابوں سے چند نسخے حکیم جی نے یاد کر لیے۔ لاہور کے غلام احمد صاحب حکیم نون محمد کی طرح ڈاکٹری اور حکمت کے دعویدار نہیں۔ ان کی سرگذشت پڑھنے سے لاکھوں کا بھلا ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کی سرگذشت سننے سے گو لاکھوں کا بھلا تو نہیں ہوتا مگر پھر بھی سننے والے خوش رہتے ہیں۔ خوشی سے صحت بنتی ہے۔ اس طرح سے ان کا بھلا ہوتا ہے۔

دراصل حکیم نون محمد افسر ہونے کے باوجود بالکل سادہ لوح انسان ہیں۔ کیونکہ کلرک سے سیدھے افسر بنے ہیں اس لیے آپ شکل و صورت اور خاص کر لباس کے لحاظ سے افسر کم اور کلرک زیادہ نظر آتے ہیں۔ حکیم جی اللہ تعالیٰ کی حکمت سے افسر تو بن گئے مگر اُن کو شاید یہ علم نہ تھا کہ ان کے اوپر جو افسر ہیں وہ سادگی اور شرافت کے ساتھ چست و چالاک اور عمدہ لباس والے ماتحت افسروں

کو پسند کرتے ہیں۔ دفتروں میں آجکل قابلیت اور اہلیت پر کم اور ٹیپ ٹاپ پر زیادہ نظر رکھی جاتی ہے اس لیے حکیم جی کے ساتھ اُن کی سادگی اور کلرکانہ لباس کی وجہ سے خاصی گڑبڑ ہوتی رہی۔

ایک بار کسی نے حکیم جی سے کہا "حکیم جی آپ اللہ کے حکم سے افسر ہیں۔ افسروں کی طرح بنے ٹھنے رہا کریں۔ عمدہ لباس۔ کوٹ پتلون پہنا کریں"

تھوڑی دیر کے بعد دیکھا کہ حکیم جی نے قمیص پتلون سے باہر نکال لی ہے جب پوچھا "حکیم جی یہ کیا بات ہوئی!"

کہنے لگے "یہ بش شرٹ ہے"

گرمیوں میں ایک افسر ساتھی چودھری قدرت اللہ نے حکیم جی کو ٹائی کے فائدے بتائے، اور کہا "آپ بھی ٹائی باندھا کیجیے۔"

تھوڑی دیر کے لیے حکیم جی سیٹ سے غائب ہو گئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ گرمی اور دھوپ میں بازار سے ٹائی خرید کر لا رہے ہیں چوہدری صاحب سے ٹائی باندھنے کا طریقہ سیکھتے گئے اور جب سمجھ میں نہ آیا تو اُن سے بندھوالی اور آج تک اسی طرح بندھی بندھائی اُتار لیتے ہیں اور پہن لیتے ہیں۔ حالانکہ ٹائی کی ناٹ اس اتار چڑھاؤ میں سنگاڑھا بن چکی ہے۔

ایک دن آپ دفتر نہ آئے کسی وجہ سے رخصت پر تھے۔ دو تین گھنٹے بعد ایک گول مول لیاقت جناح ملی جلی ٹوپی پہنے دھوتی باندھے ہاتھ میں سبزی کا تھیلا پکڑے دفتر کے برآمدے میں دیکھے گئے۔

چپڑاسی نے بتایا حکیم جی پوچھنے آئے تھے "آج میرا کوئی خط تو نہیں آیا"

حکیم جی ایک بار اعلیٰ افسران کا گلہ کر رہے تھے کہ اُن کا سلوک حکیم جی سے ناگوار سا ہے۔ میں نے صلاح دی "حکیم جی حد سے زیادہ سادگی کو خیرباد کہیے۔

سمارٹ بنیے۔ افسروں کی طرح حیثیت کے مطابق لباس پہنیے۔ تاکہ آپ کے افسروں کے دل میں آپ کی عزت ہو اور ماتحتوں پر ذرا رعب"!

حکیم جی یہ سُن کر اپنے کوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے: "پانچ سال ہوئے یہ کوٹ کا کپڑا دس روپے گز لیا تھا۔ آج کل پچیس روپے گز ہوگا"!

میں نے مُسکرا کر عرض کیا مگر لوگوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ دس روپے گز تھا اور اب پچیس روپے گز ہے۔ بہتر ہے کہ بائیں بازو پر دس روپے گز تھا اور دائیں بازو پر "پچیس روپے گز ہے" کا لیبل باندھ لیں۔

حکیم جی سادگی سے مُسکرانے لگے۔

آپ کی سادگی کی انتہا اس واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے کہ آپ ایک اتوار کو بھینس چرانے کے لیے بہ نفسِ نفیس تشریف لے گئے۔ شہر سے باہر آپ ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر گھر کا حساب کتاب سوچنے لگے اور بھینس کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ بھینس آخر حکیم جی کی بھینس تھی سادگی سے بغیر سوچے سمجھے ایک ایسے کھیت میں جا گھسی جس کا مالک وہاں موجود تھا۔ اس نے بھینس کو تین چار ڈنڈے مار کر بھگا دیا۔ اس پر حکیم جی اور کھیت والے میں بات چیت ہو گئی اور اس گنوار نے شاید حکیم جی کو گوالا سمجھا اور اپنے ڈنڈے کا حکیم جی پر بھی ناجائز استعمال کیا۔ حکیم جی بھینس چھوڑ کر بھاگے اور بھینس چونکہ سدھائی ہوئی تھی۔ ان کے پیچھے پیچھے بھاگی اس طرح سے بخیریت تمام دونوں گھر پہنچ گئے۔

حکیم جی کا کہنا ہے کہ ان کی مُرغیاں بھی سدھی ہوئی ہیں وہ دانہ تو دوسروں کے گھروں میں جا کر کھاتی ہیں مگر انڈے گھر آ کر دیتی ہیں۔

حکیم جی کے ایک دوست مسٹر احمد دین کی بیگم لیڈی ڈاکٹر ہیں حکیم جی غصّے میں اُن کے گھر جا دھمکے۔ تمام واقعہ بیان کیا۔ . . . . کمر کے نچلے حصے یعنی پشت پر چوٹیں پڑی تھیں۔ وہ بار بار لیڈی ڈاکٹر صاحبہ کو دکھانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر ان کے

دوست مسٹر احمد دین حکیم جی کو یقین دلا رہے تھے کہ حکیم جی آپ جو کچھ فرماتے ہیں سچ ہے چوٹیں دکھانے کی کوشش نہ کریں ہوا لگ جائے گی مطلب تو یہ تھا کہ بھینس کی چوٹیں کسی مرد ڈاکٹر کو دکھائیں۔

آخر میں حکیم جی کا مطالبہ سرٹیفکیٹ تھا مقدمہ کرنا چاہتے تھے۔

مسٹر احمد دین نے سمجھایا "حکیم جی سرٹیفکیٹ تو جب چاہیں مل جائے گا مگر اس مقدمہ کا کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ اس واقعہ کا سوائے بھینس کے اور کوئی گواہ نہیں اور بھینس بول نہیں سکتی اور اگر بھینس اتفاق سے بول بھی پڑی تو مجسٹریٹ نہیں مانے گا کیونکہ بھینس آپ کی سدھائی ہوئی ہے"۔

حکیم جی کے یہی دوست ایک اور واقعہ بیان کرتے ہیں جو حکیم جی کی سادگی پر شہادت عظیم ہے۔

گرمیوں کے دن تھے آدھی رات کے وقت حکیم جی نے ان کو آجگایا۔ کہنے لگے "انیما کین" ابھی چاہیے۔

ایک تو آدھی رات کو آنا پھر انیما کین مانگنا، یہ سن کر تشویش ہوئی ضرور کوئی سخت بیمار ہے۔

مسٹر دین نے پوچھا، "حکیم جی خیریت ہے"؟

حکیم جی فرمانے لگے "بھینس کے کٹے کو قبض ہے اس کے لیے "انیما کین" چاہیے"۔

دوسرے تیسرے دن بھینس کے کٹے کی خیریت دریافت کی تو افسوس سے فرمایا "وہ وفات پا گیا"۔

حکیم جی کی سادگی کے واقعات کہاں تک بیان کیے جائیں۔ ان کو قلمبند کرنے کے لیے ایک دفتر اور دو کلرک چاہییں۔ ان کی تمام باتیں اور واقعات، رولڈ گولڈ کے پانی

سے لکھنے کے قابل ہیں۔

ایک مرتبہ واقعہ اُوں ہوا کہ ٹیلی ویژن خریدنے کی خوشی میں دفتر کے تمام لوگوں کو کھانے کی دعوت دے بیٹھے۔ فرشی انتظام کیا گیا۔ جب سب مہمان آگئے اور کھانے کے لیے تیار ہو گئے تو حکیم جی تمام دیگچے ہانڈیاں، دہی کے کونڈے کمرے میں اُٹھا لائے اور درمیان میں رکھ کر فرمایا۔ "خوب کھاؤ۔"

حکیم جی کے ایک عزیز دوست جو ان کے ہم وطن بھی ہیں دو ایک دن کے لیے میرے ہاں آکر ٹھہرے۔ ایک شام حکیم جی سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے اور ساتھ مجھے بھی جانا پڑا۔ پہلے تو حکیم جی ان کو فارسی کتابوں میں سے نسخے پڑھ کر سناتے رہے اور لفظ بلفظ ترجمہ کرتے رہے۔ اس جوش و خروش سے ترجمہ سمجھا رہے تھے کہ جیسے آیتوں کا ترجمہ کر رہے ہوں۔ ذرا چپ ہوئے تو ہم نے جانے کی اجازت چاہی حکیم جی نے مجبور کیا کہ چائے پی کر جائیں چائے بالکل تیار ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد حکیم صاحب ایک بہت بڑی چائے کی ٹرے اندر سے اُٹھا لائے۔ ٹرے میز پوش سے ڈھکی ہوئی تھی اور میز پوش ٹرے سے ایک فٹ اونچا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے حکیم جی ٹرے میں ایک چھوٹا سا مندر اُٹھا کر لا رہے ہوں۔ میں نے ٹرے کی اونچائی دیکھ کر دل میں خیال کیا کہ حکیم جی نے دوست کے لیے شاندار طریقے سے خاطر تواضع کا بندوبست کیا ہے جو اتنی بڑی اور بھری ہوئی ٹرے اُٹھا لائے۔ ضرور بہت بڑا کیک۔ پیسٹری اور مٹھائی وغیرہ ہوگی۔ مگر جب اُنھوں نے ٹرے میز پر رکھ دی اور کپڑا اُٹھایا تو حیرت کی انتہا نہ رہی چائے کے ساتھ ایک بہت بڑی پلیٹ گنڈیریوں سے بھری ہوئی رکھی تھی اور اسی پلیٹ نے میز پوش کو گنبد نما بنا رکھا تھا۔ اور ہمیں مغالطے میں ڈال دیا۔

ان کے دوست سے نہ رہا گیا بولے ۔ "حکیم جی چائے کے ساتھ گنڈیریوں کا

کیا میل ہے۔"

فرمانے لگے۔ "مفرح ہیں مفرح۔"

حکیم جی جہاں حد سے زیادہ سادہ ہیں وہاں یاد داشت بھی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ ان سے کبھی پوچھیے۔ "حکیم جی مسور کی دال کب کھائی تھی۔"

دن تاریخ، اور وقت تک بتا دیں گے۔ اپنے حافظے کی خود تعریف کرتے ہیں اس لیے ماننا ہی پڑتا ہے کہ اتنا نیک آدمی جھوٹ کیسے بول سکتا ہے۔

حکیم جی کو اپنے یاد کیے ہوئے نسخے سنانے کا بہت شوق ہے ایک دن مجھے گھیر بیٹھے۔

کہنے لگے۔ "میں آپ کو ایسی گولیاں دوں گا کہ آپ کے سر کے بال سیاہ ہو جائیں گے۔"

میں نے عرض کیا۔ "حکیم جی میرے سر پر ڈھائی سو نہیں تو تین سو بال ہوں گے ان گنتی کے بالوں کو سیاہ کر کے کیا کروں گا۔"

میرے اس اشارے کے باوجود دوسرے دن میری غیر حاضری میں دو سو گولیاں میرے گھر چھوڑ گئے۔ مجھے جب علم ہوا تو کیا کر سکتا تھا گولیوں کو ایک جگہ رکھ کر بھول گیا۔ پندرہ بیس دن بعد حکیم صاحب پھر تشریف لائے ادھر ادھر کے نسخے سنانے کے بعد فرمایا۔ "آپ کے ذمے کچھ حساب ہے۔"

میں نے عرض کیا "کس بات کا۔"

کہنے لگے۔ "دو سو گولیوں کا۔ سات روپے تین آنے نو پائی۔"

میں نے با دلِ نخواستہ سات روپے تین آنے نو پائی کی رقم حاضر کر دی۔

پوچھنے لگے۔ "گولیوں کا کچھ اثر بھی ہوا۔"

میں نے کہا۔ "ابھی کھانے کا ارادہ تو نہ تھا مگر اب سات روپے تین آنے نو پائی کی

گولیاں کھانی ہی پڑیں گی۔ اثر بشرطِ زندگی بعد میں عرض کر دوں گا۔

حکیم جی کے پاس ایک خاص نسخہ مایوس اور بے اولاد والدین کے لیے ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جب ان کے والد کے اولاد نہ ہوتی تھی تو ان کے والد نے خود استعمال کیا تھا اور پھر کیا اثر ہوا۔ اس کا زندہ ثبوت وہ بذاتِ خود ہیں۔ حکیم جی کو یقین ہے کہ یہ نسخہ کبھی خطا نہیں کرتا۔ جن بے اولاد والدین کو اس کا استعمال کرایا اللہ تعالیٰ نے اُن کو اولاد عطا کی۔ مگر سب سے بڑے تعجب اور مزے کی بات یہ ہے کہ حکیم جی خود بے اولاد ہیں گو دو شادیاں کیں مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو اولاد عطا نہ فرمائی۔ اصل میں لوگ چشمہ سے پانی پیتے ہیں چشمہ اپنا پانی خود کیسے پی سکتا ہے۔ اگر ایسا ہونے لگے تو دنیا نہ اُلٹ جائے۔ حکیم جی کے اولاد نہ ہونا قدرت کے قانون درست ہونے کا ثبوت ہے۔

حکیم جی خود کہا کرتے ہیں کہ پہلی بیوی کو اس لیے طلاق نہیں دی تھی کہ اس کے اولاد نہ ہوئی تھی۔ بلکہ اس لیے طلاق دینی پڑی کہ اس نے ان کے ساتھ گھی فراڈ کیس کیا تھا۔ آپ بزبانِ خود فرماتے ہیں کہ: میں خالص گھی گاؤں سے لایا کرتا تھا مگر گھی کا کنستر چند دنوں میں غائب ہو جاتا تھا اور کچھ پتا نہ چلتا تھا کہ گھی کہاں جاتا ہے۔

حکیم جی کہتے ہیں کہ ایک دن دفتر میں میری طبیعت خراب ہو گئی میں دفتر سے چھٹی کر کے وقت سے بہت پہلے گھر کے لیے روانہ ہوا۔ باہر کا دروازہ بند تھا۔ مگر گھر سے پراٹھے پکنے کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا کچھ جواب نہ آیا پھر کھٹکھٹایا پھر جواب ندارد۔ میں نے دروازے کی درز سے آنکھ لگا کر دیکھا تو نظر آیا کہ کسی کے لیے پراٹھے پک رہے ہیں۔ اس دن مجھے علم ہوا کہ یہ گھی کہاں جاتا ہے۔

حکیم جی کی باتیں سن کر آپ ضرور مانیں گے کہ واقعی ان کی باتیں امریکن رولڈ گولڈ کے پانی سے لکھنے کے قابل ہیں۔

ہدایت نامہ عاشقاں

جناب کوبراج ہرنام داس جین کا تخلص شائد بی اے ہے انہوں نے اور دیگر حضرات نے بہت سی کتابیں از قسم ہدایت نامہ خاوند۔ ہدایت نامہ بیوی، ہدایت نامہ والدین۔ ہدایت نامہ بچگان اور ہدایت نامہ بندگان وغیرہ وغیرہ لکھی ہیں لیکن کسی کو اللہ تعالیٰ نے اتنی توفیق نہ دی کہ "ہدایت نامہ عاشقاں" لکھتا اور دنیا اور آخرت میں سرخروئی حاصل کرتا۔

شادی کے بعد محبت فرمانے کے طریقے تو سب نے بیان کیے۔ لیکن کسی نے یہ بتانے کی تکلیف گوارا نہ کی کہ شادی سے پہلے محبت کو کامیاب بنانے کے کیا طریقے ہیں۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں شادی کی لکیر غائب ہو اگر وہ محبت میں مبتلا ہو جائیں تو کیا کریں۔ افسوس اس مضمون پر کوئی کتاب نہیں۔ میں اس موضوع پر کوئی کتاب لکھنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس کے بکنے کے امکانات بہت کم ہیں۔ زیادہ تر لوگ کتاب مانگ کر پڑھ لیتے ہیں۔ اس لیے اس مضمون پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ یہ مضمون ذاتی تجربہ کی بنا پر نہیں لکھا جا رہا بلکہ اس مضمون کے تحریر میں آنے کی وجہ میرے دوست احباب کے واقعات اور حالات ہیں۔ محبت انہوں نے کی، تجربہ انہوں نے حاصل کیا، مضمون لکھنے کا فخر مجھے حاصل ہوا۔

مشہور ہے کہ محبت کی نہیں جاتی۔ ہو جاتی ہے۔ مان لیا یہ بات بالکل سچ ہے لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ محبت ہو جانے کے بعد اس کو نبھایا کس طرح جائے اور انجام

تک کس طرح پہنچا یا جائے۔ صرف محبت ہو جانے سے تو تسکین نہیں ہو جاتی لیلیٰ سے ملاقات یا بات چیت کی منزل تک پہنچنے کے لیے بے شمار مشکلیں پیش آتی ہیں۔ اس بارے میں خواجہ حافظ شیرازی خود فرما گئے ہیں۔ کہ

عشق آساں نمود اول و لے افتاد مشکل ہا

ان مشکلات کو اس مضمون میں حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ بڑے بڑے انگریز فلسفی کہتے کہتے مر گئے کہ ہر انسان پر تین دور آتے ہیں۔ صرف شیطان اور فرشتے اس سے مبرا ہیں محبت کے ان حادثوں سے انسان کو زندگی میں لازماً دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کسی وقت انسان کو اپنے آپ سے محبت ہو جاتی ہے یعنی وہ اپنے آپ کو خوبصورت سمجھ کر اپنے آپ سے اُنس کرنے لگتا ہے۔ اپنی آرائش میں مصروف رہتا ہے۔ اسی کوشش میں رہتا ہے کہ کس لباس کو کس طریقے سے پہنے تاکہ دوسروں کو بھی خوبصورت لگے بالوں کو کس طرح بنائے۔ مونچھوں کو کو لشا مار کہ دے کہ وہ اور خوشنما نظر آنے لگیں یہ پہلا دور ہے جس کو اپنے آپ سے محبت کہتے ہیں۔ دوسرا دور اپنی جنس سے محبت کا ہے جیسے مرد کا مرد سے محبت کرنا اور عورت کا عورت سے۔ اس دور کے متعلق مجھے کچھ علم نہیں۔ فارسی کے استاد اور کالج کے پروفیسر اس دور پر اچھی طرح روشنی ڈال سکتے ہیں کیونکہ ان کے مشاہدہ میں یہ دور اکثر آتا رہتا ہے۔

تیسرا دور غیر جنس سے محبت کا ہے۔ غیر جنس سے مراد۔ مرد کا عورت اور عورت کا مرد سے محبت کرنا ہے۔ مرد کا گائے سے یا عورت کا اونٹ سے پیار نہیں۔ اس مضمون کا کا تعلق اسی دور سے ہے یعنی اس محبت سے جس کو چچا غالب نے دماغ کا خلل کہا ہے۔

محبت ویسے تو ہر جگہ ہو سکتی ہے اور کی جا سکتی ہے لیکن آسانی زیادہ تر عزیزوں اور رشتہ داروں کے ہاں محبت کرنے میں ہوتی ہے کیونکہ ان کے ہاں اکثر بلا روک ٹوک

آنے جانے کے موقعے ملتے رہتے ہیں میل ملاپ اور بات چیت میں آسانیاں ہوتی ہیں
چچا، ماموں اور خالہ کی لڑکیاں، چیپ جان کا کام دیتی ہیں۔ اصل میں یہ کم خرچ
اور بالانشین قسم کی محبت ہوتی ہے اور سہولتوں کی وجہ سے اکثر کامیاب رہتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر محبت کسی غیر جگہ ہو جائے تو پھر کیا کیا جائے۔ اگر کوئی
لیلیٰ پسند آجائے، دل کو بھا جائے تو اُس کو اپنی طرف کس طرح متوجہ کیا جائے
یا کس طرح ظاہر کیا جائے کہ آپ کو اس سے محبت ہے۔ اس مضمون میں جو طریقے
بتائے گئے ہیں استعمال میں لائیے۔ بہت کارگر، مجرب اور ہومیوپیتھک ہیں نقصان
کا احتمال تو نہیں لیکن اگر کسی قسم کا نقصان ہو جائے تو یقین کیجیے وہ اپنی
حماقت سے ہوگا۔ ان طریقوں کے جملہ حقوق میرے یا کسی اور کے نام محفوظ نہیں
اس لیے بلا خوف و خطر ان پر عمل کیجیے۔ اللہ کارساز ہے اور اس کے بعد دوسرا کارساز
فورڈ ہے۔ لیکن وہ اس معاملہ میں آپ کے کیا کام آسکتا ہے۔

جب اچانک محبت ہو جائے تو سب سے پہلے ہمت اور حوصلہ درکار ہے
اپنی لیلیٰ پر ظاہر کرنا ہے کہ آپ کو اس سے محبت ہے۔ اس کے لیے اُسے بتانا
پڑے گا اور صاف الفاظ میں بتانا پڑے گا کہ آپ اس سے محبت کرتے ہیں۔
صرف یہی فقرہ "مجھے آپ سے محبّت ہے" کہنے کے لیے ہمت اور حوصلہ درکار
ہے۔ اگر آپ اس کو نہ بتائیں گے تو اس کو علم کیسے ہوگا کہ آپ کو کیا تکلیف ہے
اور وہ آپ کے لیے کیا کر سکتی ہے۔ اس لیے خوف زدہ نہ ہوں۔ بزدل نہ بنیں،
موقع ملتے ہی صاف صاف کہہ دیں کہ آپ کو اس سے محبت ہے۔ یہ امید ہرگز نہ
رکھیں کہ وہ خود پیش قدمی کرے گی۔ اس طرح تو آپ ارمانوں اور حسرتوں کو دل میں
لیے ہوئے بوڑھے ہو جائیں گے اور لیلیٰ نانی اماں بن جائے گی اور پھر وہ آپ کے
کس کام کی۔ اس لیے بہتر ہے کہ بلا جھجک خوف و خطر سب حال کہہ دیں۔ یاد

رکھیے جیسے صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔ وقت گذرتا جاتا ہے ویسے ہی وہ دو منٹ بھی گذر جائیں گے۔ جب آپ اس سے کہنا چاہیں گے کہ "مجھے تم سے محبت ہے" آپ نے ہمت کرکے یہ دو منٹ گذار لیے تو آپ کی بعد کی زندگی بہت حد تک آسان اور خوشگوار ہو جائے گی۔ اور پھر لیلیٰ کے دل میں تو محبت کا جذبہ پہلے سے ہی موجود ہوتا ہے اور اسی کے متعلق خواجہ حافظ شیرازی فرما گئے ہیں؛ ع

عشق اول در دلِ معشوق پیدا مے شود

پس و پیش قدمی کیجیے آگے میدان کھلا ہے۔

جب لیلیٰ کے علم میں یہ بات آجائے کہ آپ اس کی محبت میں گرفتار ہیں تو اس کے بعد چند پیٹنٹ قسم کے فقرے ضرور دہرائیے جو بہت ہی فائدہ مند ہوتے ہیں۔ اور ان کا اثر لیلیٰ پر خوشگوار پڑتا ہے۔ مثلاً "جس دن سے آپ کو دیکھا ہے بے حد بے چین ہوں"۔ "نہ جانے آپ میں کیا کشش ہے کہ دل کھنچا چلا جا رہا ہے" — "آپ نے تو مجھ پر جادو کر دیا ہے" — "آپ کا نام تو بہت میٹھا ہے" — "آپ کے بغیر زندہ رہنا ناممکن ہے" — "زندگی تو آپ کی ملاقات سے شروع ہوئی ہے۔ پہلے کی تمام زندگی بے کار گئی" — "آپ کے لیے دل، جگر، جان سب حاضر ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ یہ فقرے مسکین اور یتیم صورت بنا کر کہیے۔ دو تین بار آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر ریہرسل کر لی جائے تو وقت پر کوئی دقت نہیں ہوتی یا پھر چند دن کے لیے یتیم خانہ میں داخل ہو کر مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ لیلیٰ سے ہر وقت ملاقات ہو۔ اس لیے اکثر پرچہ بازی سے کام چلانا پڑتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پیغام رسانی کے لیے کون سے ذرائع کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ جن سے کام بھی چلتا رہے خرچ بھی کم ہو اور کسی قسم کا شور و شر بھی نہ ہو۔

پیغام رسانی کے لیے بہترین ذریعہ لیلیٰ کی چھوٹی بہن پہلے اور دوسرے نمبر پر لیلیٰ کا چھوٹا بھائی ہے۔ ان کی عمر نو دس سال سے اوپر نہیں ہونی چاہیے۔ انگریز مضمون نگار چارلس لیمب نے یہ سلسلہ بہت کارآمد بتایا ہے۔ لیلیٰ کی چھوٹی بہن سے اُنس پیدا کیجیے۔ اس کا اثر لیلیٰ پر بہت اچھا پڑے گا ۔۔۔ وہ آپ کا برتاؤ اپنی چھوٹی بہن سے دیکھ کر آپ کے متعلق بہت اچھی رائے قائم کرے گی۔ ویسے بھی چھوٹی لیلیٰ بڑی لیلیٰ کی کاربن کاپی ہوتی ہے وہ ہمیشہ اپنی بڑی بہن کو آپ کے متعلق بہت سی باتیں بتاتی رہے گی مثلاً بھائی جان بہت اچھے ہیں۔ مجھے بہت سی چیزیں لے کر دیتے ہیں۔ سیر کے لیے جاتے ہیں۔ کہانیاں سُناتے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔ البتہ اس میں تھوڑا سا خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ چھوٹی لیلیٰ آپ کے خط لے کر جائے گی اور جواب لائے گی۔ اس لیے لالچ کے طور پر اس کو ٹافی وغیرہ لے کر دینی پڑتی ہے۔ ڈر صرف اس بات کا ہوتا ہے کہ چھوٹی لیلیٰ آخر بچی ہے کسی وقت ایسی بات مُنہ سے نکال کر "چیرنگ کراس" پر محبت کا بھانڈا نہ پھوڑ دے لیکن مٹھائی کے لالچ سے بے چاری ذرا محتاط رہتی ہے۔

اپنی لیلیٰ کو خط لکھتے ہوئے اُس پر پانی کے چند قطرے ٹپکا دیں تاکہ لیلیٰ کو اس بات کا احساس ہو کہ محبت کا حملہ کس قدر شدید ہے اور جدائی میں رو رو کر خط لکھا گیا ہے۔

بدقسمتی سے جس لیلیٰ کا بھائی ہو نہ بہن وہاں پر ملازم سے کام لیا جاسکتا ہے وہ آسانی سے پیغام رسانی کا کام کر سکتا ہے لیکن اس قوم کا اعتبار نہیں۔ نہ معلوم کب خانساموں کی محفل میں بیٹھ کر راز فاش کر دے۔ کہیں ذرا خفا ہوا یا گھر والوں نے نکال دیا بس اس نے اشتہار دینا شروع کر دیا۔ پھر ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ ملازم کمبخت دونوں طرف سے کھاتا ہے وہ جانتا ہے کہ دونوں طرف ہے آگ

برابر لگی ہوئی۔ اس لیے وہ دونوں طرف ہاتھ سینکتا ہے۔
ادھر آپ کو نچوڑے گا "جی بس ایک ہی روپیہ یہ تو بہت کم ہے جناب! ایک پرانی پتلون ہی عنایت فرمائیے۔ یا پھر "جناب پلازا میں تانگے والی لگ گئی۔ مس صوبی ہا کام کرتی ہے پاس دلوائیے" وغیرہ وغیرہ اور ادھر لیلیٰ سے بلیک میلنگ کرے گا۔ "بی بی جی ابھی تک آپ نے آٹھ آنے نہیں دیے پرسوں وعدہ کیا تھا۔
چھوٹے بچے میں یہ بات نہیں۔ اس بے چارے کا منہ تو ٹافی اور چاکلیٹ سے بند ہو جاتا ہے۔ ملازم کی خدمات کو کام میں لانے سے پہلے ان سب باتوں کو ذہن میں رکھیے گا۔ اس میں خرچ زیادہ ہوتا ہے۔ ملازم کا رعب ماننا پڑتا ہے اور راز کے فاش ہونے کا بھی ڈر ہوتا ہے۔

جس گھر میں یہ دونوں ذرائع میسر نہ ہوں وہاں پر اس کام کے لیے بہتر ذریعہ جمعدارنی ہے۔ جمعدارنی سے مراد مہتر کی اہلیہ محترمہ ہے۔ فوج سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ جمعدارنی بخدا ایک لاجواب چیز ہوتی ہے اور ملازم سے بہت زیادہ قابلِ اعتماد ہوتی ہے۔ آپ کے بتائے بغیر ہر بات سمجھ جائے گی۔ دونوں طرف بڑی ہوشیاری سے کام کرے گی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی گی۔ آپ کا کام بھی بناتی رہے گی اور اپنا گھر بھی بھرتی رہے گی۔ آپ کو روپیہ پیسہ سے رگڑے گی اور آپ کی لیلیٰ سے شلوار قمیص وصول کرے گی یعنی تنخواہ آپ کے سر اور روٹی کپڑا اس لیلیٰ کے سر۔ لیکن جو کچھ وصول کرے گی اسے حلال کر دکھائے گی۔ آپ اس کہنہ مشق حلال خور پر کامل بھروسہ کر سکتے ہیں۔

جس جگہ اللہ کے فضل سے کوئی بھی سلسلہ نہ بن سکے۔ بچہ، ملازم، جمعدارنی، کوئی بھی کام نہ آسکے تو اس جگہ اب لیلیٰ کے باپ سے تو کام لینے سے رہے۔ وہاں پر ایک ہی صورت ہے کہ خود ہمت سے کام لیا جائے۔ اگر یہ نہ ہو سکتا ہو تو پھر گھر

میں بیٹھ کر لوڈو کھیلیے۔

ایک کارآمد طریقہ یہ بھی ہے کہ لیلیٰ کو رومانی ناول اور کتابیں بھیجنے کا سلسلہ جاری کیجیے۔ کتابوں میں بھی خط وغیرہ لکھ کر رکھا جا سکتا ہے۔ رومانی کتابیں لیلیٰ کے دل میں رومانی جذبات پیدا کریں گی اور وہ اپنے آپ کو ہیروئن تصور کرے گی۔ قدرتی بات ہے کہ پھر اُس کو کورم پورا کرنے کے لیے ایک ہیرو کی بھی ضرورت پڑے گی۔ اور نظر انتخاب لا محالہ آپ پر پڑے گی۔ کیونکہ اس کارِ خیر کے لیے فوری طور پر آپ ہی دستیاب ہوں گے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ آپ لیلیٰ کے لیے نئی نئی کتابیں خریدیں گے اور دوسرے یہ کہ آپ کے پاس کتابوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو جائے گا۔ اور تھوڑے عرصے میں آپ مفت میں ایک لائبریری کے مالک بن جائیں گے۔

یہ کوشش بھی کیجیے کہ کوئی نہ کوئی لیلیٰ کی تحریر آپ کے ہاتھ میں آجائے جس سے راز فاش ہونے کا اُسے ڈر رہے۔ اس راز کے چھپانے کے لیے وہ آپ کی تابع اور مطیع رہے گی۔ آپ کی ہر بات مانے گی۔ آپ کا دم بھرے گی۔ اگر آپ حقہ پیتے ہیں تو حقہ بھی بھرے گی۔ گو اس طریقے سے آپ لیلیٰ پر حاوی تو رہیں گے لیکن یہ اصلی محبت نہ ہوگی۔ تھانیدارانہ محبت ہوگی۔

محبت کے معاملے میں لباس کو بھی بڑا دخل ہے جیسا لیلیٰ یا اس کے خاندان کا لباس ہو۔ ویسا ہی اپنا بھی ہونا چاہیے۔ اگر خاندان پرانے خیالات کا حامی ہے تو اچکن، شیروانی، اور پاجامہ کام میں لائیے۔ سوٹ بوٹ سے نفرت ظاہر کیجیے۔ یہ فکر نہ کیجیے کہ آپ شیروانی میں کھگوسے نظر آتے ہیں۔ بہت سی لیلائیں ایسی ہیں جن کو کنکوے مرغوب ہیں اور خوب اُڑاتی ہیں۔ اگر داڑھی رکھنی پڑے تو رکھ لیجیے۔ نماز ادا کیجیے بات بات میں ان شاء اللہ العزیز کہیے۔ آپ آم کھائیے اگر موقع ملے تو چوس لیجیے اور پیڑ نہ گنیے۔ اگر خاندان ترقی پسند قسم کا ہے تو اس کے مطابق لباس رکھیے۔ یہ ہیں وہ طریقے جو محبت

کو جاری رکھنے اور بڑھانے میں استعمال کیے جا سکتے ہیں۔

محبت رواں ہو جانے کے بعد اس کے بہت فائدے ہیں۔ انسان نڈر ہو جاتا ہے اپنی ہی دُھن میں مست اور مسرور رہتا ہے۔ مدہم سروں میں مالکونس گاتا رہتا رہتا ہے اور اپنے آپ کو ہیرو سمجھتا ہے۔ محبت میں جہاں تحفے وغیرہ دینے پڑتے ہیں وہاں وصول بھی بہت ہوتے ہیں۔ مفت میں کڑھے ہوئے رومال تکیے کے غلاف سینٹ کی شیشیاں وغیرہ ملتی رہتی ہیں۔

یہ ہمیشہ یاد رکھیے کہ اگر محبت خدانخواستہ ناکام رہے اور شادی نہ ہو سکے تو انجام شراب نوشی یا خودکشی ہوتا ہے اور اگر بالکل ہی بزدل انسان ہے تو یاد اللہ پہ آ کر تان ٹوٹتی ہے۔

اگر دوران محبت موقع واردات پر گرفتاری ہو جائے تو بدنامی کے علاوہ انسان بلا وجہ مرمت او ور ہال ہو جاتا ہے اور اگر محبت کامیاب ہو جائے اور ختم شادی پہ ہو تو پھر کیا کہنے بقول شخصے پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں ہوتا ہے۔

ع

مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما

چپڑاسی سے افسر تک

کسی ملک کی مضبوطی کا انحصار وہاں کے دفتروں پر ہوتا ہے اور دفتر کی مضبوطی کا انحصار چار ستونوں پر ہوتا ہے۔ ان ستونوں کا الگ الگ نام افسر، سپرنٹنڈنٹ، کلرک اور چپڑاسی ہے۔ مطلب یہ کہ جس جگہ یہ چار عناصر اکٹھے ہو جائیں وہاں دفتر بن جاتا ہے۔ آئیے ان ستونوں کا جائزہ لیں کہ یہ کیا ہوتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔

سب سے پہلے چپڑاسی کو لیجیے۔ یہ عجیب اور دلچسپ ہستی ہے۔ اس بے چارے کی جتنی تنخواہ کم ہوتی ہے اتنی ہی گردن سیدھی اور اکڑی ہوئی رکھتا ہے۔ اور جس کی گردن چھوٹی ہو وہ طرہ دار پگڑی رکھ کر کمی پوری کر لیتا ہے۔

اکثر چپڑاسی ایسے بھی ہیں جو اپنے گاؤں جا کر اپنے عزیزوں اور دوستوں پر رُعب گانٹھنے کے لیے اپنی تنخواہ اس طرح بتاتے ہیں۔ "جناب میری اور صاحب کی تنخواہ تیرہ سو اٹھاون روپے بارہ آنے ہے۔" اب یہ گاؤں والوں کو ہی سوچنے دیجیے کہ تیرہ سو کس کی ہے اور اٹھاون روپے بارہ آنے کس کی۔

چپڑاسی کی شان اُس وقت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ جب وہ صاحب کے کمرے کے باہر بیٹھا ہوتا ہے۔ کیا مجال کوئی اُس سے اجازت

لیے بغیر کمرے کے اندر جا سکے۔ بشرطیکہ وہ صاحب کا افسر یا دوست نہ ہو۔ عام آدمی تو کمرے کے قریب تک نہیں آسکتا۔ چپڑاسی صاحب دور سے چلاّ اُٹھیں گے۔ "ٹھیرو بابو اندر جانے کا حکم نہیں" وہ کچھ اس انداز اور رُعب سے کہے گا جیسے وہ صاحب کا افسر یا چیف ہو۔

اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جتنا بڑا اور نرم طبیعت افسر ہوتا ہے اتنا ہی اکڑا ہوا اور بگڑا ہوا اُس کا چپڑاسی ہوتا ہے۔ بعض چپڑاسی بہت شریف اور خاکسار قسم کے ہوتے ہیں مگر بہت کم۔

چپڑاسی ایسا ہمت والا انسان ہے جو صاحب کے نام سے کئی باتیں ایسی بھی کر گذرتا ہے جس کا صاحب کو علم تک نہیں۔ دفتر میں سپرنٹنڈنٹ سے صاحب کے لیے کوئی چیز لانے کے بہانے سے وہ ایک روپے اینٹھ لے گا۔ اِدھر سپرنٹنڈنٹ وہ ایک روپیہ کم رقم جان کر سوچتا ہے کہ صاحب سے کیا مانگوں اُدھر چپڑاسی گول ہو جاتا ہے۔ یا کانٹین سے ایسی چیز جو صرف صاحب کو مل سکتی ہے اس کا نام لے کر اپنے گھر لے جاتا ہے۔

یہ بات بھی مشاہدہ میں آئی ہے کہ ہر چپڑاسی دوسرے چپڑاسی کا مقروض ہوتا ہے۔ یہ زنجیر کی طرح ایک لمبا سا سلسلہ ہے۔ چپڑاسی کو ہر ماہ کے شروع میں بہت نرم طبیعت دیکھا گیا ہے جس کانٹین کے بیرے پر وہ اکثر رُعب جماتا ہے۔ اس سے بڑی منت سماجت سے بات کرتا ہے اور اپنے چائے کے بل کی ادائیگی اگلے ماہ پر ملتوی کرا لیتا ہے۔ اور جب ہر طرح اگلے ماہ پر بات ختم ہو جاتی ہے تو پھر اپنی اصلیت پر آجاتا ہے۔

چپڑاسی کی ایک خاص صفت یہ ہے تبدیل شدہ افسر کی نئے افسر کے سامنے اُلٹے الفاظ میں تعریف کرتا ہے۔ اس کے لیے جو افسر آئے بہت اچھا اور

جو چلا جائے وہ کم اچھا۔

چپڑاسیوں میں ایک عادت یہ بھی ہوتی ہے کہ اپنی کلاس فور افسروں کی محفل میں بیٹھ کر بڑے مزے لے کر اپنے صاحب کے گھر کے حالات کا انکشاف کر دیتے ہیں۔ صاحب اور بیگم کی نوک جھونک کا دل کش انداز سے نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس کے باوجود چپڑاسی کو اپنے صاحب کا اعتماد حاصل ہوتا ہے۔

دفتر میں چپڑاسی کی سرکاری حیثیت گو کم ہوتی ہے لیکن بزرگی کا درجہ اُس کا بڑا ہوتا ہے۔ سٹاف کے لوگ اُس کو مخاطب کرتے ہوئے چاچا کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جس سے خوش ہو کر وہ ہر قسم کا کام بخوشی اور پھُرتی سے کرتا ہے۔

چپڑاسی حقیقت میں دفتر کی بلڈنگ کا ایک اہم مگر ٹیڑھا ستون ہے۔ اِسی طرح سے صاحب کا ڈرائیور اگر سرکاری ہو تو وہ بھی مندرجہ بالا صفات کا حامل ہوگا۔

دوسرا زبردست ستون کلرک ہے۔ اس کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ چھوٹا کلرک۔ بڑا کلرک۔ کم تنخواہ والا۔ کام کرنے والا عیش کرنے والا۔ اصلی میٹرک نقلی میٹرک۔ ایف اے پاس۔ بی اے فیل۔ وغیرہ۔ ایک قسم لیڈی کلرک کی بھی ہوتی ہے لیکن آٹے میں نمک کے برابر۔

کلرکوں کی قسمیں چاہے کتنی ہوں مگر عام طور پر اُن کی ذہنیت ایک جیسی ہوتی ہے۔ دفتر میں کام کرتے کرتے ان کے دل و دماغ ایک سانچے میں ڈھل کر پیٹنٹ ہو جاتے ہیں۔

کلرک کی خاص صفت یہ ہے کہ جتنا پرانا ہوتا جائے گا اتنا ہی ٹرخاؤ کام

میں طاق ہوتا جائے گا۔ کلرک کا ظاہری ٹیپ ٹاپ اور لباس سے ای۔اے۔سی سے کم نظر نہیں آتا۔ مگر اندرونی حالت ملزم کی سی ہوتی ہے۔ یہ بے چارہ گھریلو حالات اور اخراجات میں گھرا ہوا ہوتا ہے۔ بے صبری سے ہر ماہ پہلی تاریخ کا انتظار شروع کر دیتا ہے۔ اس کی تنخواہ کا ایک معقول حصہ دفتر کی کانٹین میں چائے کا بل ادا کرنے میں خرچ ہوتا ہے۔ اور یہ بل کبھی پورا ادا نہیں ہوتا۔ اگر بل بیس روپیہ ہے تو پندرہ روپیہ ادا کرے گا اور پانچ روپیہ بقایا رکھے گا تاکہ کانٹین والے سے تعلق قائم رہے اور وہ اپنے پانچ روپے کی وصولی کے لیے آئندہ بھی اُسے ادھار دیتا رہے۔

ٹفن روم کی ادھار چار پینے پلانے میں کلرک اپنے وقت کا عمر خیام ہے ٹفن روم کے حساب کی کاپی کلرک کے بنک کی پاس بک ہوتی ہے جس میں ہر روز اس کا بنک بیلنس بڑھتا جاتا ہے۔ پہلی تاریخ کو جب بیرہ پاس بک اس کے پاس لے کر آتا ہے تو کلرک بہادر گھبرایا ہوا نظر آتا ہے اور سر نیچے کر کے کسی فائل میں محو ہونے کا بہانہ کرتا ہے۔ اگر بیرہ کاپی سامنے کرنے کی ہمت کرے تو وہ اُسے جھڑک دیتا ہے " دیکھتے نہیں بہت ضروری کام ہو رہا ہے۔ یہ فائل ابھی ابھی پٹ اپ، کرنی ہے۔ ٹھہر کر آنا"

جس طرح دفتر میں کلرک کے بہت سے گاہک، قرضہ وصول کرنے والے ہوتے ہیں۔ اسی طرح گھر پر بھی قرض خواہوں کا ایک کیو، لگا ہوا ہوتا ہے۔

اگر کبھی کلرک کو صلاح دی جائے کہ اتنا قرضہ کیوں لینے ہو جو ادا نہ ہو سکے۔ آمدنی کے حساب سے خرچ کرنا چاہیئے تو وہ مُسکرا کر جواب دیتا ہے " بڑی بڑی حکومتیں قرض لیتی ہیں اور لے کر ادا نہیں کرتیں میری نیت تو پھر بھی صاف ہے۔ جب حالات درست ہوئے تمام قرضہ ادا کر دوں گا۔ مگر یہ

معاملات، کبھی درست نہیں ہوتے۔

کلرک بے چارہ ہمیشہ دو بیماریوں کا شکار رہتا ہے۔ ایک قرض اور دوسری تپ دق۔ حقیقت میں کلرک بے چارہ کرے بھی کیا وہ بھی اس بات کا جائز رونا روتا ہے کہ دنیا میں ہر چیز کی قیمت آٹھ گنا بڑھ گئی ہے مگر کلرک ہیں کہ اُن کی وہی قیمت ہے۔ ساٹھ روپے جو پہلے تھی سو اب بھی ہے۔ اس اعتبار سے کلرک کی حالت واقعی قابل رحم ہے۔

کلرک میں ایک صفت یہ بھی ہے کہ اگر ایک فائل لے کر کسی دوسرے سیکشن میں جائے گا تو تمام دفتر کا چکر کاٹ کر آئے گا۔ فائل کے بہانے تمام دوستوں سے گپ شپ کر کے اور چائے پی کر لوٹے گا۔ پانچ منٹ کا کام بہت محنت اور تسلی سے دو گھنٹے میں ختم کر کے آئے گا۔ چیل کی طرح کام کم اور شور زیادہ کرے گا۔ جیسے تمام دنیا کا بوجھ اسی کے سر پر ہے۔ کسی کلرک کے پاس کتنا کام ہے۔ اس کا اس کی چیخ پکار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے جو جتنا زیادہ شور کرتا ہے کہ بہت کام ہے بہت کام ہے اتنا ہی اس کے پاس کام کم ہوتا ہے۔ کام کرنے والے کلرک خاموش طبیعت ہوتے ہیں۔

اکثر کلرکوں کو نا جائز شکایت ہوتی ہے کہ ہر قسم کا فالتو کام یا ایسا کام جو کسی کی سمجھ میں نہ آئے اُن کے ذمے ڈال دیا جاتا ہے۔ اور اس سلسلے میں وہ اکثر آپس میں جھگڑ پڑتے ہیں اور طاقت کا مظاہرہ اس جوش و خروش سے کرتے ہیں جیسے جائداد کے لیے لڑ رہے ہوں۔

رمضان المبارک کے دنوں میں کلرک ٹفن روم میں داخل ہوتے ہی پہلے جیب سے سگریٹ اور ماچس نکالتا ہے۔ اسے روزہ کم اور سگریٹ زیادہ تنگ کرتا ہے۔

کلرک کی بہترین صفت یہ ہے کہ اپنے افسر کے سامنے اپنے عزیز سے عزیز ترین دوست کے متعلق غلط بیانی کرنے میں عار محسوس نہ کرے گا۔ اسے اس حرکت سے روحانی مسرت ہوتی ہے۔ لیکن تمام کلرک ایسے نہیں ہوتے۔ ان میں بعض بہت محنتی، ہوشیار اور خاموش کام کرنے والے ہوتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ کلرک اپنی بہت سی خامیوں کے باوجود دفتر کی ریڑھ کی ہڈی ہے مگر ایسی جس پر تپ دق کا اثر ہو چکا ہو۔

تیسرا ستون سپرنٹنڈنٹ یا انچارج ہے۔ یہ ایک طرف افسروں اور دوسری طرف کلرکوں میں گھرا ہوتا ہے۔ جو کچھ افسر اس سے کہیں اس کو ماننا پڑتا ہے اور جو کچھ یہ ماتحت کلرکوں سے کہے وہ حتے الوسع ماننے سے گریز کرتے ہیں۔ اس کا حساب تو بالکل وہی ہے جو کسی شاعر نے کہا ہے:

اِک طرف پاؤں اِک طرف جوتا
میری حالت جراب کی سی ہے

افسر اس سے یہ امید رکھتے ہیں کہ جو کام وہ کہیں چاہے اُس کے دائرہ اختیار میں ہو یا نہ ہو مگر فوراً ہو جائے اور کلرک جس کیس میں سوچنا پڑتا ہو اُس کی غیر حاضری میں اُس کی میز پہ پھینک جائیں گے دنیا کی کوئی بات ہو انچارج کو اُس کا ہر صورت میں علم ہونا چاہیے۔ اس سے یہاں تک امید رکھی جاتی ہے کہ وہ یہ بھی بتائے کہ تیز گام کون سے پلیٹ فارم پہ آتی ہے۔ اور ببینگن بازار میں کون سی دوکان پہ سستے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

آج کل سپرنٹنڈنٹ کو امرت دھارا یا پنسلین سمجھا جاتا ہے کہ ہر وقت اور ہر جگہ وہی کام آئے۔ انچارج کا کام بھی وہی کر سکتا ہے جو حد سے زیادہ ڈپلومیٹ ہو یا بڑی بڑی مونچھیں رکھ کر رعب ڈال سکے۔ یہ عام آدمی کے بس

کا کام نہیں۔ گو سپرنٹنڈنٹ نام تو بہت بڑا نظر آتا ہے مگر آج کل ویسی عزت نہیں جو پندرہ بیس سال پہلے تھی۔ آج کل یہ دفتر کی عمارت کا ایک ستون ہے جس پر پینٹ کیا گیا ہو۔

چوتھا اور سب سے بڑا ستون افسر ہے۔ افسر حاکم ہوتا ہے اور اللہ تعالےٰ کا حکم ہے کہ حاکموں کی تابعداری کرو۔ ان کے متعلق کچھ نہ کہو۔ تابعداری کرتے رہو جب تک ریٹائر نہ ہو جاؤ یا نکال نہ دیے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ماننا ہم سب پر فرض ہے۔ اس لیے حاکم کے متعلق کچھ نہ کہنا بہتر ہے۔ ویسے اگر آپ خود کسی دفتر میں ہیں تو اپنے افسروں کے متعلق جانتے ہوں گے اور اگر آپ دفتر میں نہیں تو پھر آپ جان کر کیا کریں گے بلکہ شکر کیجیے کہ آپ کو جاننے کی ضرورت نہیں۔

غالب از پروفیسر چھتر سنگھ ایم بی بی ایس

سردار چھتر سنگھ بی۔اے۔ ایل ایل بی ایم۔ بی بی ایس۔ ہومیو پیتھ نے غالب کے اشعار کی جو شرح لکھی ہے وہ لاجواب اور انوکھی ہے۔ جو نکتے پروفیسر چھتر سنگھ نے پیدا کیے ہیں وہ شائد خود غالب کو بھی نہ سوجھے ہوں گے۔ دیوانِ غالب کی شرح تو بہت سے اہلِ سخن حضرات نے کی ہے مگر پروفیسر چھتر سنگھ نے یہ محسوس کیا کہ تمام اہلِ سخن نے اشعار کا مطلب بالکل ایک جیسا بیان کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ شرح صرف ایک نے لکھی باقی سب حضرات نے ایک دوسرے کی نقل کی ہے۔ اس لیے جو شرح سردار جی نے بیان کی ہے وہ ہر شرح سے مختلف ہے اور بالکل نئے انداز کی ہے۔ غالب کو جو انھوں نے سمجھا ہے اور کسی نے نہیں سمجھا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ میں نے غالب کو اچھی طرح پڑھا اور بُری طرح سمجھا ہے۔ بُری طرح سے اُن کی مراد ہے کہ کیا کوئی اور سمجھ سکے گا۔

حضرت غالب کے متعلق پروفیسر صاحب صرف اتنا فرماتے ہیں :۔

"مرزا غالب دہلی میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں پڑھے لکھے دہلی میں جوان ہوئے۔ دہلی میں شادی کی۔ دہلی میں بچے ہوئے۔ اور دہلی میں ہی بچوں کا انتقال ہوا۔ دہلی میں مرزا نے شاعری شروع کی اور دہلی میں اُن کی شاعری عروج پر پہنچی۔ اور شاعری کو عروج پر پہنچا کر دہلی کا غدر دیکھا اور دہلی میں انتقال کیا۔ اور دہلی میں دفن

ہوئے اور آج تک دہلی میں دفن ہیں۔ مرزا نے یہ سب کام دہلی میں ہی کیے۔ اور کسی کی ہمت ہے کہ اتنے کام ایک ہی شہر میں کر کے دکھائے"۔

پروفیسر صاحب کے خیال میں مرزا غالب اور دہلی ایک ہی بات اور ایک ہی چیز ہے۔

پروفیسر صاحب نے شرح تو ہر شعر کی بیان کی ہے مگر یہاں پر سردار جی کے چند پسندیدہ اشعار کا مطلب جو اُنھوں نے خود بیان کیا ہے لکھا جاتا ہے پڑھیے اور سردار جی سے سر دھنوائیے۔

نیچے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں اگر توفیق ہو تو فریم میں لگوا کر کمرے کو زینت بخشیے۔

حضرت غالب نے اپنے شعروں میں صاف بیانی سے کام لیا ہے۔ کہتے ہیں :-

یہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

غالب اپنے دوست کے جور و ستم سے تنگ آچکے ہیں اور اب وہ مزید برداشت نہیں کر سکتے۔ اس لیے واضح طور پر کہتے ہیں ہماری ایسی قسمت کہاں کہ ہمارے دوست کا انتقال ہو اور ہماری جان اس سے چھوٹے۔ اس کے بعد ہم کسی اور معشوق یعنی دوست کی ورکٹ لگائیں۔ جو اتنا جور و ستم نہ کرتا ہو۔ غالب پھر خود ہی کہتے ہیں کہ ہمارا دوست اتنا سخت جان ہے کہ ہم اس کے وصال یعنی مرنے کے انتظار میں خود وصال کر جائیں گے مگر وہ انتقال نہ کرے گا۔

حضرت غالب کو جہاں کہیں موقع ملا ہے اُنھوں نے اپنے اشعار میں

انگریزی کے الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے ۔ فرماتے ہیں :

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

ہوس انگریزی کا لفظ ہے اس کے معنی ہیں "گھر" اور "کار" موٹر کار ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ تمام گھر کو موٹر کار کی بہت خوشی ہے لیکن ان کے خیال میں موٹر کار کی خوشی تو ہے لیکن جب تک کسی پہ مرا نہ جائے محبت نہ کی جائے تو زندگی کا کچھ مزا نہیں مطلب یہ ہے کہ کار بھی ہو کار کے ساتھ یار بھی ہو تو جینے کا مزا آتا ہے ۔

ایک اور شعر میں حد سے زیادہ صاف بیانی سے کام لیا ہے جو انہی کا حصہ ہے فرماتے ہیں :

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی　　آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اس شعر میں خاص غور طلب لفظ بوریا ہے ۔ بوری تو آپ نے دیکھی ہوگی یہ بوریا اس بوری کا مذکر ہے یعنی بہت بڑی بوری جس کو بورا کہا جائے تو مطلب حل ہوتا ہے شعر کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اول تو معشوق ہمارے ہاں آتا نہیں ۔ اگر کبھی بھولے سے آجاتا ہے تو بیٹھتا نہیں اُٹھ کر بھاگ جاتا ہے ۔ غالب کہتے ہیں کہ آج اُس کا ہمارے ہاں آنے کا پروگرام ہے کیونکہ یہ خبر آج بہت گرم ہے اہل محلہ کہہ رہے ہیں مگر افسوس صد افسوس ۔ اپنا یہ حال ہے کہ آج گھر میں بڑی بوری بھی نہیں کہ وہ آئے تو میں اُس کو بوری میں ڈال کر بند کر لوں تاکہ وہ پھر واپس نہ جا سکے اُٹھ کر بھاگنے کی نہ کرے ۔ یہ ہر انسان سمجھ سکتا ہے کہ بوری کسی کو بند کرنے کے لیے استعمال ہو سکتی ہے اور کس کام آسکتی ہے ۔

معشوق کے اپنے چاہنے والے کے متعلق خیالات ہمیشہ خراب رہتے ہیں وہ اس کو اچھے الفاظ میں یاد نہیں کرتا غالب کہتے ہیں ۔

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

ہیں اُن کی محفل کی رونق ہوں۔ اپنی باتوں اور زندہ دلی سے محفل کو خوش رکھتا ہوں مگر جب کسی دن میں اُن کی بزم میں نہیں جاتا اور وہ اپنی محفل کو سونی دیکھتے ہیں اور ہمیں یاد آتا ہوں تو وہ یہ نہیں کہتے کہ آج ہمارا خوش مذاق دوست ہماری محفل میں نہیں ہے بلکہ کہتے ہیں کہ آج وہ فتنہ پرور اور فسادی کہاں ہے یعنی اُن کے نزدیک میں اُن کی محفل میں "ہلا گلا" کر دیتا ہوں دنگا فساد کر دیتا ہوں میں اُن کا چاہنے والا نہیں بلکہ ایسا نمبری ہوں جس کا نام بستہ الف میں ہو۔ مگر مجھ پر اتنے مہربان ضرور ہیں۔ مجھے دنگہ فساد کرنے والا سمجھتے ہیں لیکن پولیس کے حوالے نہیں کرتے۔

حضرت غالب کو لوگوں سے بہت گلہ ہے کہ وہ اپنے مضمونوں میں غلطیاں کرتے ہیں اور پھر اپنی غلطی کا اعتراف نہیں کرتے مگر مکرر غلطیاں کرتے ہیں کہتے ہیں:۔

غلطہائے مضامیں مت پوچھ　　　لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

لوگ مضامین میں جو غلطیاں کرتے ہیں اس کے متعلق بہتر ہے کہ مجھ سے کچھ مت پوچھو اور تو اور مزے کی بات یہ دیکھو کہ لوگ نالے یعنی ازار بند کو رسہ باندھ دیتے ہیں جانے یہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ نالہ پنجابی میں ازار بند کو کہتے ہیں اب بھلا کوئی لوگوں سے پوچھے کہ تم کمر بند کو رسہ کیوں باندھتے ہو۔ اب اگر نالے سے مراد پانی کا نالہ لیا جائے تو پھر اس کو بھی رسہ باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ تو محض حماقت ہے۔ رسہ باندھنے سے کہیں پانی رک سکتا ہے۔ لوگ جو ایسی غلطیاں کرتے ہیں اللہ ان کو معاف کرے۔

معشوق کی الٹی سمجھ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ بزم ناز غیر سے چاہیے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

میں نے تو اُن کو یہ نیک صلاح دی کہ یہ آپ کی بزم ہے۔ آپ کا گھر ہے۔ انار کلی بازار یا منڈی یا مارکیٹ نہیں کہ ہر قسم کے لوگ ادھر سے غیرے آگھستے ہیں ان کا آنا بند کیجیے

میری اس نیک رائے کا شکریہ ادا کرتا تو اک طرف یہ سُن کر اس مسخرے نے مجھے ہی اپنی محفل سے نکال باہر کیا۔ اچھا صلہ دیا اس مسخرے نے نیک مصلاح کا۔

نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا

رہا کھٹکا نہ چوری کا دُعا دیتا ہوں رہزن کو

کہتے ہیں کہ اللہ کا شکر ہے اور خدا بھلا کرے مجھے لُوٹنے والے کا کہ اس نے مجھے دن کے وقت لُوٹا جس سے مجھے بہت فائدہ ہوا کیونکہ دن کا وقت تھا میں نے تسلّی سے جا کر تھانے میں رپٹ لکھوائی اور فارغ ہو کر مزے سے رات کو سو گیا کیونکہ رات اللہ تعالیٰ نے سونے کے لیے بنائی ہے اِس لیے میں گھوڑے بیچ کر سویا۔ اگر خدانخواستہ میں رات کے وقت لُٹتا تو کتنا خراب ہوتا ماحول تو نیند خراب ہوتی۔ دوسرے آدھی رات کو تھانے جانا پڑتا تیسرے رات کے وقت راستے میں کتوں کے ٹانگ پکڑنے کا اندیشہ تھا اور پھر آدھی رات کو تھانے والوں کو کیسے جگاتا وہ تو دن کو مشکل سے جاگتے ہیں۔ خدا بھلا کرے اُس رہزن کا جس نے مجھے دن کے وقت لُوٹ کر ان تمام مصیبتوں سے نجات دلائی اگر وہ چاہتا تو مجھے رات کے وقت لُوٹ کر مصیبت میں ڈال سکتا تھا مگر وہ دن کو ہی سب کچھ لُوٹ کر لے گیا۔ اب رات کو لُوٹنے کے لیے خاک بچا تھا، اس لیے مزے سے سوتا ہوں۔

دوست کی تیزی کے متعلق فرماتے ہیں۔

الجھتے ہو اگر تم دیکھتے ہو آئینہ

جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

بھئی واہ یہ تمہارا خوب حال ہے کہ آئینہ دیکھتے ہو تو اُسی سے الجھ پڑتے ہو۔ غصے میں آجاتے ہو۔ آئینہ سے لڑتے ہو۔ خدا نہ کرے اگر تمہارے جیسے اس شہر میں دو ایک اور پیدا ہو جائیں تو آئینوں سے الجھ کر تمام شہر کے آئینے توڑ کر رکھ دیں جس سے ملک اور قوم دونوں کا نقصان ہو۔

آج کل جس طرح ہر چیز کی قلت اور تنگی ہے اس وقت بھی ایسا ہی حال معلوم ہوتا ہے

چیزوں کی نایابی سے تنگ آ کر کہتے ہیں۔

بے در و دیوار کا اِک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

مکان بنانے کے لیے چیزیں نہیں ملتیں۔ میٹیریل نہیں ملتا اِس لیے کیوں نہ بغیر دروازوں اور دیواروں کے اک گھر بنا لیا جائے جب در و دیوار نہ ہوں گے تو ارد گرد ہمسائے بھی نہ ہوں گے یہ بھی ایک فائدہ ہوگا۔ نہ ہمسائے ہوں گے نہ چوری کا امکان رہے گا اور جب چوری کا کوئی خدشہ نہ ہوگا تو پھر پاسبان چوکیدار کی کیا ضرورت ایک بے در و دیوار مکان بنانے کے کتنے فائدے ہیں۔

مایوسی کے عالم میں ایک شعر ہے۔

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی!
کبھی کودکی میں جس نے نہ سُنی مری کہانی

کیا خوب فرمایا ہے اور کیا استدلال ہے کہ جب میں چھوٹا ہوتا تھا بچہ تھا بالکل معصوم تھا تو تب اُس کافر ادا نے میری کوئی بات نہ مانی۔ اب تو میں اللہ کے فضل و کرم جوان ہو گیا ہوں اب تو وہ معصومیت باقی نہیں رہی بلکہ لاکھوں طوفان سینے میں ٹکریں مار رہے ہیں تو ایسی حالت میں وہ میری بات کیوں مانے گا۔

ایک معرفت کا شعر ملاحظہ ہو فرماتے ہیں۔

کعبہ کس مُنہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

جب شرم آئے تو کعبہ جانا چاہیے اور شرم کب آتی ہے جب انسان الٹی سیدھی حرکت کرتا ہے یا گناہ کرتا ہے اور اس گناہ کو بخشوانے کے لیے کعبہ چلا جاتا ہے تو اس لیے اے غالبؔ! جب تم نے گناہ نہیں کیا تو شرم کیسے آئے گی جب شرم ہی نہیں تو کعبہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ایک معاملے میں چاہنے والے سے غلطی کا اعتراف کس خوبصورتی سے ادا کرایا ہے کہتے ہیں

گدا سمجھ کے وہ چُپ تھا مِری جو شامت آئی
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

میں اپنے دوست کے پاس اندر جانے کے لیے بیقرار تھا اور پاسبان کے قدموں کے پاس بیٹھ کر اس کی منتیں کرتا رہا۔ خوشامد کرتا رہا۔ مگر وہ چوکیدار کوئی جواب نہ دیتا تھا۔ وہ مجھے گداگر یعنی بے وقوف سمجھ کر چُپ رہا۔ اُس کی خاموشی سے مجھے غلط فہمی ہوئی میں یہ سمجھا کہ اس لیے چپ ہے کہ مجھ سے ڈرتا ہے میں اور شیر ہو گیا۔ اب میری جو شامت آئی تو میں نے جلدی سے اُٹھ کر پاسبان کی ٹانگ کھینچ لی تاکہ میں جلدی سے دوست کے پاس اندر چلا جاؤں۔ بس پھر کیا تھا "اللہ دے اور بندہ لے"۔

آخری پسندیدہ شعر کے متعلق پروفیسر صاحب فرماتے ہیں "غالب کا یہ شعر لاجواب ہے۔ شعر ہے۔

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

واہ وا، کیا بات ہے اس شعر کی۔ جب یہ مقرر ہو چکا ہے کہ موت دن کے وقت آئے گی۔ رات کو ہرگز نہ ہو گی تو پھر تعجب کی بات ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ رات کے وقت نیند کیوں نہیں آتی۔ حالانکہ مرنا تو دن کے وقت ہے رات کو تو نیند آجانی چاہیے، سخت تعجب ہے"۔

حقیقت میں ہم کو سردار چھتر سنگھ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ہومیو پیتھ پر سخت تعجب ہے کہ انہوں نے ایسا سوجھ بوجھ اور سمجھ والا دماغ کہاں سے پایا جس کا کوئی جواب نہیں۔

ملکۂ کوہسار کی آغوش میں

تو چھٹی لے کے آجا بالماں

قدرت کو دیکھنا ہو یا قدرت کی صنعت کاری سے لطف اندوز ہونا ہو تو مری تشریف لے جایئے۔ راولپنڈی سے مری تک قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہوں اور مری پہنچ جائیں تو قدرت کی صناعی دیکھیں۔ مری حقیقت میں قدرتی طور پر دلکش اور انسانی طور پر خوبصورت مقام ہے۔ اس حسین خطے میں بہتی ندیاں شور کرتی ہیں جو اور ناتجربہ کار دل ملنے کو زور کرتے ہیں۔ اس لیے اکثر کالجوں کے طلبار کالج بند ہوتے ہی اور کلرک لوگ چھٹی ملتے ہی مری کی طرف بھاگتے ہیں۔ مری میں کراچی۔ لاہور، پشاور، اور دیگر شہروں سے لاتعداد لوگ آتے ہیں۔ راولپنڈی تو بالکل مری کے دامن میں ہے۔ اس لیے اہل راولپنڈی اس قربت کا ناجائز فائدہ اٹھانے سے نہیں چوکتے جب دل چاہا اور جب موقع ملا مری چل دیے۔

اگر قسم قسم کے لوگ دیکھنے ہوں تو مری جاکر دیکھیے۔ امیر لوگ گرمی کا موسم گذارنے کے بہانے مری آتے ہیں اور اپنی ضرورت سے بہت زیادہ کمائی ہوئی آمدنی ٹھکانے لگا جاتے ہیں۔ ادیب حضرات صرف دماغ کو تازہ رکھنے اور دل کو ٹھنڈک پہنچانے آتے ہیں۔ یہاں پر شاعرے اور ادبی محفلیں منعقد کرتے ہیں۔ اپنی غزلیں افسانے اور مضامین پوسٹ مارٹم کے لیے پیش کرتے ہیں اور ان کی جائز اور ناجائز چیر پھاڑ دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھتے اور سنتے ہیں اور خاموشی سے برداشت کر کے چلے جاتے ہیں۔ جوان بے فکرے لوگ اور کالج کے طلبار بہتی ندیا کا شور سننے آتے ہیں۔ اکثر کی تو کھلے بندوں

ملاقات ہو جاتی ہے اور اکثر چھپ چھپ کر دل ملانے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں۔ کندھوں پر کیمرے لٹکائے اسی تاک میں رہتے ہیں کہ موقع ملتے ہی بہتی ندیا کو کیمرے میں بند کر لیں۔ کن کن فلموں کے پرنٹ ٹھیک نکلتے ہیں یہ اُنہیں کو معلوم ہوگا

مری میں دفتروں کے کلرک صاحبان بھی دیکھنے میں آتے ہیں مگر اُن کا خوشنما لباس اور چال ڈھال دیکھ کر ان کو پہچاننا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ جس انداز سے وہ مال پر چکر لگاتے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کلرک نہیں کم از کم چھوٹے موٹے افسر ہیں۔ یہ بے چارے جیسے خشک آتے ہیں ویسے ہی شان و شوکت کے ساتھ چکر لگا کر خشک واپس چلے جاتے ہیں بلکہ کچھ حسرت اور کچھ ارمان ساتھ لے کر واپس جاتے ہیں۔

پچھلے دو ایک سال سے یہاں پر چھوٹی چھوٹی "بے بی براؤنی" قسم کی داڑھیوں والا ایک خاص طبقہ بھی نظر آتا ہے۔ ان حضرات کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ مال پر صرف یہی لوگ نظر آئیں گے۔ اگر آپ کو فرصت ہے تو اُس دن کا انتظار کیجیے۔

یہاں پر آپ کو جگہ جگہ قسم قسم کے لوگ ہر لباس میں نظر آئیں گے۔ اچکن اور شیروانی والے، شلوار قمیص والے اور زیادہ تر مغربی لباس والے۔ اسی طرح ساڑھیاں۔ غرارے، شلواریں ریشمی اور پیراشوٹ کی۔ اور چند زنانی پتلونیں بھی نظر آئیں گی۔

خواتین بھی ہر قسم اور ہر طبقے کی آتی ہیں زیادہ تعداد ایڈوانس سے بھی دو قدم آگے چلنے والی ہوتی ہے جو میدانوں کی تپش اور دھوپ سے ڈر کر پہاڑوں میں پناہ لینے اور پہاڑوں کو اپنی گرمی سے ٹھنڈک پہنچانے آتی ہیں۔ ان کا لباس نئے سے نئے فیشن اور ڈیزائن کا ہوتا ہے۔ بال انوکھے سے انوکھے طریقے سے بنائے ہوتے ہیں اور سر سے پاؤں تک میک اَپ ہی میک اَپ ہوتا ہے۔ یہ طبقہ زیادہ تر

ٹیلر میڈ اور ٹائیلٹ میڈ ہوتا ہے۔ شکل وصورت تو اللہ کی طرف سے ہے اگر ان کی خوبصورتی میں کوئی کمی رہ جائے تو یہ طبقہ کسی حد تک اس کمی کو لباس اور میک اَپ سے پورا کر لیتا ہے۔ ان خواتین کے چہرے زیادہ تر امریکن رولڈ گولڈ ہوتے ہیں اگر اصلی چہرہ دیکھنا مقصود ہو تو کپڑے دھونے کے موٹے چھلپا صابن سے مُنہ دھلوا کر دیکھیے یا پھر اللہ تعالیٰ موقع دے تو صبح سویرے مُنہ اندھیرے چہرے کی ایک جھلک دیکھ لیجیے۔ آپ حیران رہ جائیں گے کہ چہرہ چاند کا ٹکڑا ہے یا ہاتھی کا دانت جس کے دو روپ ہوتے ہیں۔ ان خواتین کے میک اُپ فیشن ایبل لباس اور چلنے پھرنے کے دلکش انداز سے ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے یہ خواتین "مس مری" کے مقابلہ حُسن کے لیے آئی ہوں اور اس کے مقابل میں تمام مرد حضرات جس انداز اور نظروں سے ان خواتین کو دیکھتے ہیں اور ان کے لباس شکل وصورت اور چال ڈھال پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرات اس مقابلہ میں جج صاحبان ہیں خوبصورتی میں نمبر دینا یا کسی کو خوبصورت ترین قرار دینا ان کے قطعی اختیار میں ہے۔

خواتین کا ایک ایسا طبقہ بھی مری آتا ہے جو ساس یا سسر کے ڈر سے اُن کی جہاندیدہ آنکھوں میں خاک جھونک کر لاہور اور پنڈی سے چلتے وقت تو برقع پہن کر نکلتا ہے مگر جونہی اُن کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے برقع اُتار دیتا ہے اور جب مری پہنچتا ہے تو بستر کھول دیتا ہے اور برقع تہ ہو جاتا ہے۔

خواتین کا ایک طبقہ ایسا بھی نظر آتا ہے جو مال روڈ پہ برقع پہن کر تو ضرور نکلتا ہے مگر نقاب اُلٹ کر چلتا ہے۔ سیاہ برقعے میں سفید سفید چہرہ جس پر میک اَپ سے چار چاند لگے ہوتے ہیں ایسا نظر آتا ہے جیسے تھوڑا سا سنگھاڑا چھیل دیا ہو بعض سیاہ چہرے پر اتنا پوڈر تھپا ہوا ہوتا ہے کہ جامن پر چھڑکے ہوئے نمک یا باورچی خانے میں سفیدی کا گمان ہوتا ہے۔ برقع پہن کر لیکن نقاب اُٹھا کر چلنے کا فائدہ اور مقصد

معلوم نہیں۔ یا تو سیاہ بیک گراؤنڈ میں سفید میک اپ والے چہرے کی نمائش اچھے طریقے سے ہوتی ہے۔ یا لباس کو مری کے نظر نہ آنے والے گرد سے بچانا مقصود ہوتا ہوگا۔

ایک گروہ ایسا بھی دیکھنے میں آتا ہے جس میں جوان خواتین تو بے پردہ ہوتی ہیں لیکن ان کے ساتھ ادھیڑ اور پختہ عمر کی خواتین سفید لمبے برقعوں میں لپٹی ہوئی شرمائی شرمائی پھرتی ہیں۔ جوان خواتین سفید برقعوں کی رکھوالی کرتی ہیں یا سفید برقعے جوان خواتین کی یعنی کون کس کے چارج میں ہے۔ یہ مسئلہ ایسا ہے جسے حل کرنا از بس دشوار ہے۔

ایک مختصر سا گروہ ایسا بھی نظر آتا ہے جو ہوتا ہے بے پردہ، لیکن اتنا شرمایا اور سمٹا سمٹا چلتا ہے، جس سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ یہ گروہ بے پردہ پھرنے کا ایک عادی نہیں۔ بلکہ ان کا پردہ ان کے خاوندوں یا وارثوں نے زبردستی ان سے چھین لیا ہے اور بقول اکبر الہ آبادی اپنی عقل پر ڈال لیا ہے۔ یہ خواتین زیادہ کلرک بہادروں کی بیویاں ہوتی ہیں جن کو ہنسنے سے لے کر ہنس کی چال چلنے تک کی مشق کرائی جاتی ہے۔

ان خواتین و حضرات کے علاوہ ایک اور مختصر سا معزز گروہ ایکٹروں اور ایکٹرسوں کا بھی نظر آتا ہے۔ یہ گروہ صبیحہ سنتوش کمار مسرت نذیر اور سدھیر پر مشتمل ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ لاہور کے سٹوڈیوز محرم کے احترام کی وجہ سے دس دن کے لیے بند کر دیے جاتے ہیں۔ محرم کے ان دس دنوں میں فلم سازی یعنی شوٹنگ وغیرہ معیوب سمجھی جاتی ہے۔ مگر تعجب ہے کہ تمام پکچر ہاؤسوں میں ان فلموں کی نمائش معیوب نہیں سمجھی جاتی۔ احترام کی وجہ سے آرٹسٹ حضرات دس دن تک فلم کی شوٹنگ میں حصہ نہیں لیتے۔ اور مری آ جاتے ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں قیام فرما کر احترام رمی یا فلیش (جس کو آسان اردو میں جوا کہتے ہیں) کھیل کر وقت کاٹتے ہیں۔ یا شام کو مال پر نکلتے ہیں تو لیڈروں کی طرح اپنے پیچھے ایک جلوس اکٹھا کر لیتے ہیں اور جب تک سیزن میں داخل نہیں ہو جاتے یہ جلوس پیچھے پیچھے لگا رہتا ہے۔ کمی ہے تو صرف اتنی کہ جلوس زندہ باد

کے تعر سے نہیں لگاتا۔

صبیحہ، سنتوش، مسرت نذیر اور سدھیر پاکستان فلم انڈسٹری کے چوٹی کے اداکار تصور کیے جاتے ہیں۔ ان کا مقابلہ اور کوئی اداکار کر ہی نہیں سکتا کیونکہ اور کسی کو موقع ہی نہیں ملتا۔ پاکستان فلم انڈسٹری میں ان کے علاوہ اور کوئی اداکار داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ یہی اول ہیں اور یہی آخر۔ ان آرٹسٹوں کا حساب اس طالب علم کی طرح ہے۔ جو امتحان میں فیل ہو کر بھی دوسرے نمبر پر آیا تھا کیونکہ کلاس میں لڑکے صرف دو تھے یہ حقیقت ہے کہ ان چہروں کو بار بار ہر پکچر میں دیکھ کر طبیعت اکتا گئی ہے۔ ایک پکچر میں مرتے ہیں تو دوسری میں پھر تازہ دم ہو کر آجاتے ہیں۔ اور خدا جانے کس چکی کا پسا کھاتے ہیں کہ دن بدن پھیلتے جا رہے ہیں۔ اگر پھیلنے کی یہی رفتار رہی تو ایک دن ایسا آئے گا کہ سینما سکوپ سکرین پہ پورے نظر نہ آسکیں گے۔ ڈر صرف اس بات کا ہے کہ اگر خدانخواستہ دس پندرہ سال کے بعد ہمارے آج کل کے اداکار موٹے اور بھدے یا بوڑھے ہو گئے تو ہماری فلم انڈسٹری کا کیا بنے گا لیکن ہمارے ملک میں یہ خاص بات دیکھی گئی ہے کہ جو یہاں پیدا ہوتا ہے عجوبہ روزگار پیدا ہوتا ہے اس کا نعم البدل ملنا ناممکن ہے مثالیں آپ خود سوچ سکتے ہیں جو حضرات یہاں سے جا چکے ہیں اُن کی جگہ آج تک کوئی نہ لے سکا صبیحہ اور مسرت کے بعد کیا بنے گا خدا ان کی عمر دراز کرے اور ان کی جوانی برقرار رکھے۔ آمین۔

مری میں جو حضرات بزنس کی غرض سے آتے ہیں وہ بہت فائدے میں رہتے ہیں اور ہر سودے میں آم کے آم اور گھٹلیوں کے دام بناتے ہیں۔ ہر چیز کی قیمت اگر دُگنی نہیں تو ڈیڑھ گنی ضرور وصول کرتے ہیں، دو تین مہینے کا سیزن دو تین سال کی آمدنی کے برابر ہوتا ہے مزے کی بات یہ ہے کہ ہر چیز راولپنڈی سے سستے داموں خرید کر لائی جاتی ہے اور لوگ مہنگی قیمت پہ خرید کر وہی چیز واپس راولپنڈی یا لاہور لے جاتے ہیں اور بطور تحفہ پیش کرتے ہیں۔ سب سے زیادہ بزنس ہوٹل اور ریسٹوران وغیرہ کا چلتا ہے۔ اور اتنا چلتا ہے کہ اس کے

ساتھ ہوٹل والوں کا دماغ بھی چل جاتا ہے۔ سیمز، لینڈمارک، اور فرکوس جانے کا اتفاق ہو تو آپ دیکھیں گے کہ ان کی سروس میں دیر آید ضرور ہوتا ہے درست آید نہیں۔ فرکوس میں نو بج کر بیس منٹ پر ایک میز پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔ نو بج کر انتالیس منٹ پر یعنی انیس منٹ بعد حضور بیرہ بہادر نے نزولِ اجلال فرمایا اور ساتھ ہی دیر سے آنے کا چلتا ہوا بہانہ کر دیا۔ "صاحب میں سمجھا دوسرا بیرا آرڈر لے گیا ہے"۔ دراصل یہ بیرہ بہادر بھی زیادہ ٹپ دینے والوں کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان ہی کے آگے پیچھے رہتے ہیں۔ خیر آرڈر لینے کے بعد تقریباً بیس منٹ اور گذر گئے آہستہ آہستہ تھوڑا تھوڑا کر کے چائے لائی گئی۔ وہ اس طرح کہ پہلے ایک پیالی لاکر رکھی گئی۔ اس کے بعد چینی دان آگیا۔ اس کے بعد چائے دانی رکھ کر وہ دودھ دان لینے چلا گیا۔ قسطوں میں چائے ملتی صرف مری کے رسٹوران میں دیکھی گئی۔ فرکوس میں تو قسطوں میں ہی چائے مل گئی۔ ایک شام سیمز میں آدھ گھنٹے انتظار کے بعد ویسے ہی اُٹھ کر آنا پڑا تھا اور اتنا شکر ہے کہ رسٹوران والے بغیر چائے پئے اُٹھنے تو دیتے ہیں۔ اگر روک لیں تو کوئی کیا کر سکتا ہے جس دن سیمز میں بھیڑ ہوتی ہے میز پر جگہ تو ایک طرف اوپر جانے کا راستہ تک نہیں ملتا حقیقت یہ ہے کہ بزنس مسلمانوں کے بس کا روگ نہیں۔ بزنس تو بنیا کر کے چلا گیا۔ ایک بزرگ اکثر دعا کیا کرتے تھے یا اللہ مسلمان کو مکان دے مگر اس کے اپنے رہنے کے لیے کرایہ پر دینے کے لیے ہرگز نہ دے ورنہ خود بھی تنگ ہوتا ہے اور کرایہ دار کو بھی تنگ کرتا ہے اور اے اللہ مسلمان کو اتنا پیسہ دے کہ وہ خرچ کر کے ختم کر دے اتنا نہ دے کہ وہ اس سے بزنس شروع کر دے اس طرح وہ خود بھی تنگ ہوتا ہے اور گاہک کو بھی تنگ کرتا ہے۔ افسوس ہمارے اس بزرگ کی دعا قبول نہ ہوئی۔

مختلف قسم کی ٹریننگ کے لیے اپنے ملک کے جوان لوگ غیر ممالک میں ہر سال بھیجے جاتے ہیں کیا ہی اچھا ہو اگر بزنس کی ٹریننگ کے لیے چند مسلمانوں کو ہر سال باہر

بھیج دیا جائے تاکہ بزنس کے تمام اصول خاص کر انداز گفتگو سیکھ کر آئیں۔ غالب مرحوم شاید ہمارے دوکانداروں کے متعلق ایڈوانس شعر فرما گئے ہیں۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

لنٹاٹ بھی سروس کے لحاظ سے سیمز اور فرکوس کا بھائی ہی ہے لوئر بازار کے ریسٹورانوں میں سروس اچھی دیکھی گئی مگر برتن خراب اور بیٹھنے کی جگہ خراب تر میرے خیال میں اگر مال کے ہوٹلوں کے منتظمین اور بیروں کو لوئر بازار کے ہوٹلوں میں منتقل کر دیا جائے اور لوئر بازار والے مال کے ریسٹورانوں میں منتقل ہو جائیں تو تمام حساب کتاب فٹ ہو جائے۔

آخر میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ گرمی کا موسم گذارنے کے علاوہ چھٹی لے کر مری جانے کا اصل مقصد کیا ہے، مال روڈ پوسٹ آفس سے لے کر بیریئر تک پانچ سو ستر مردانہ قدموں کا فاصلہ ہے۔ اس پانچسو ستر قدم کے فاصلے کو لوگ دس دس بارہ بارہ بار طے کرتے ہیں۔ کبھی پوسٹ آفس سے بیریئر کو جاتے ہیں اور کبھی بیریئر سے پوسٹ آفس کو۔ شام کے چھ بجے سے رات کے نو بجے تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے چھوٹے چھوٹے گروہ کہیں تھوڑا سا چلتے ہیں۔ کہیں تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر جاتے ہیں۔ کسی نہ کسی مس مری، کو پاس سے گذرتا دیکھ کر جج کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے چُست لباس چال ڈھال۔ ناک نقشہ پر آپس میں فقرے بازی ہوتی ہے۔ قہقہے لگتے ہیں اور پھر یہ گروہ کسی اور مس مری، کو جج کرتے آہستہ آہستہ آگے چل پڑتا ہے۔ تمام سیزن ہر شام یہی روٹین سلسلہ جاری رہتا ہے۔ خواتین بغیر مس مری منتخب ہوئے اور مرد حضرات بغیر مس مری کا انتخاب کیے اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے ہیں آپ پھر سوچیے کہ پانچسو ستر قدم اس طریقہ سے بار بار طے کرنے کا آخر مقصد کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمام لوگ مرد اور عورتیں اس بات کی جستجو میں مارے مارے مال پر پھر رہے ہوں

مجھے خود دس سال سے اس بات کی جستجو ہے مگر آج تک وجہ معلوم نہ ہو سکی۔

اگر انسان ٹھنڈے دل اور سنجیدگی کے ساتھ سوچے کہ وہ پڑھا لکھا اور مہذب ہو کر ایسی حرکت کیوں کرتا ہے۔ بغیر کسی مقصد کے وہ اتنے چکر مال روڈ کے کیوں لگاتا ہے تو اس کا معقول جواب اس کے پاس کچھ نہیں ہوگا۔ یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ مال ایک ایسی جگہ ہے جہاں پر ہر ایک سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک بار ملاقات کرنے کے بعد بار بار اسی جگہ گھومتے رہنا اور دس بارہ مرتبہ ملاقات کرنے سے کیا حاصل۔ اگر آپ کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ ہے اور آپ بیریہ سے آگے نکل جائیں تو آپ کو ایک جاہل انسان آپ کی اس حرکت کا معقول جواب دے گا وہ آہستہ سے آپ سے عرض کرے گا "ڈنگی صاحب"۔

کیا معقول جواب ہے گو وہ ڈنگی آپ کے بچے کے لیے پیش کرتا ہے۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ آپ کو مال روڈ کے بار بار بلا وجہ چکر لگاتے دیکھ کر آپ کو "ڈنگی صاحب" کہہ رہا ہو۔ کیونکہ ایسا فضول کام کرنا اس کے ناقص خیال میں صرف "ڈنگی" ہی کر سکتا ہے۔ اگر واقعی یہ سچ ہے تو پھر یہاں چھٹی لے کر آنا "ڈنگی" بننے کے مترادف ہے۔

چمچ چور کانفرنس

سب سے پہلے یہ بتایئے کہ چمچ چور کسے کہتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ کو علم نہ ہو تو سنیئے۔ چمچ چور ایک ٹیکنیکل ٹرم ہے۔ اس کی شانِ نزول میں ایک پرانا اور مشہور قصہ اس طرح سے ہے کہ ایک نواب صاحب نے بڑے پیمانے پر دعوت دی۔ دعوت میں بڑے بڑے لوگ مدعو تھے۔ اور چھوٹے چھوٹے بندوبست اور سروس میں لگے ہوئے تھے سستا زمانہ اور دعوت بڑے آدمی کی کھانے کا سب سامان ایک سے ایک اعلیٰ۔ کھانے کی میز پر دیگر قیمتی سامان کے علاوہ سونے کے چمچے بھی رکھے گئے تھے۔ ایک معزز مہمان کی طبیعت سونے کے چمچ دیکھ کر للچا گئی اور وہ اس تاک میں رہے کہ موقع ملے تو ایک آدھ چمچ کسی طرح کھسکا لیں اتفاق کی بات۔ اس دعوت میں ایک اور معزز مہمان کو بھی چمچے پسند آ گئے۔ پہلے مہمان نے مناسب موقع دیکھ کر چمچہ اُٹھایا اور کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اور کوئی تو اُن کی یہ حرکت دیکھ نہ سکا مگر دوسرے مہمان کی نظر پڑ گئی۔ اس نے دل میں سوچا لو بھئی یہ خوب رہی۔ یہ مفت میں ہی ہاتھ مار گیا کچھ ایسی ترکیب کرنی چاہیے کہ یہ حضرت چمچہ جیب سے نکال دیں سوچتے سوچتے اُنہوں نے ترکیب نکال ہی لی۔ جب کھانا ختم ہوا تو فرمانے لگے

"میں میزبان کا سب دوستوں کی طرف سے اس پرتکلف دعوت پر شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس موقعہ پر آپ دوستوں کو ایک شعبدہ دکھاتا ہوں جو آپ یقیناً پسند کریں گے اور مجھے اس بات کا دعویٰ ہے کہ ایسے شعبدے سوائے ہمارے ملک کے لوگوں کے اور کسی ملک کا کوئی فرد نہیں دکھا سکتا۔ دوستو آپ دیکھ رہے ہیں یہ سونے کا ایک چمچ ہے میں آپ کے سامنے اس

چمچہ کو اپنی جیب میں رکھ رہا ہوں۔ اب میں یہی چمچ آپ میں سے کسی ایک دوست کی جیب سے برآمد کر دکھاؤں گا۔ اپنے اپنے کوٹ کی جیبوں پہ ہاتھ رکھ لیجیے۔

مہمانوں نے اپنے اپنے کوٹ کی جیب کو سنبھالا اور معزز مہمان نے تمام مہمانوں پر نظر دوڑا کر اس مہمان کی طرف اشارہ کیا جس کی جیب میں چمچہ تھا اور بولے "میرے دوست ذرا کرسی سے کھڑے ہو جائیں۔ دوستو اب آپ دیکھیں گے کہ وہ چمچہ جو میں نے اپنی جیب میں رکھا تھا وہ ان کے کوٹ کی اندر کی جیب میں چلا گیا ہے۔ میرے دوست اب ذرا جیب میں اپنا ہاتھ ڈال کر چمچہ نکال لیے"

پہلا مہمان تاڑ گیا اس نے اس چال پہ بہت پیچ تاب کھائے مگر مجبوراً جیب میں ہاتھ ڈال کر چمچہ نکال دیا۔ مہمانوں کو حیرت ہوئی۔ انہوں نے خوب تالیاں بجائیں اور اس شور میں مہمان نمبر ۲ چمچہ لے کر چلتے بنے۔ دونوں مہمان تھے چمچ چور۔

یہ تو قصہ چمچ چور کا تھا۔ لیکن آج کل بد قسمتی سے یہ خطاب بے چارے خانساموں کے لیے استعمال ہوتا ہے کیونکہ یہ طبقہ کھانا پکاتے وقت نمک چکھنے کے بہانہ سے فی چمچ کافی مصالحہ غائب کر دیتا ہے۔ اکثر شام کو یا فرصت کے وقت باغ میں یا کسی اور جگہ چار پانچ خانساماں لوگ اور ملازم جب اکٹھے ہوتے ہیں تو اپنے صاحبوں اور بیگم صاحبوں کی خوب تعریف کرتے ہیں اور اکثر انگریزی کے الفاظ جو انہوں نے صاحب سے سنے ہوتے ہیں استعمال کرتے ہیں مگر تلفظ غلط ہوتا ہے ایک چمچ چور کانفرس میں اس تعریف کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔

شام کے وقت کسی باغ میں چار پانچ خانساماں اور ملازم لوگ فرصت کا وقت نکال کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پاس ہی چند بچے کھیل رہے ہیں۔ ملازموں میں کوئی کسی پروفیسر کا خانساماں ہے، کوئی ڈاکٹر کا کوئی کسی میجر کا اور کوئی دفتر کے کسی سپرنٹنڈنٹ کا۔

ڈاکٹر کا ملازم کہنے لگا: "ایمان سے یہ ڈاکٹر بڑا کنجوس ہے، ایک ایک پیسے پہ مرتا ہے۔ غریب سے غریب آدمی سے بھی فیس نہیں چھوڑتا۔ پوری نہ ملے تو جتنی بھی ہو وصول کر

لیتا ہے۔ ایمان سے اگر کہیں اس کے ہاتھ کتا آجائے تو اس سے دودھ نکال لے، مگر ایمان سے میں اس کو بھی رگڑا دیتا ہوں۔ جہاں موقع ملا کچھ نہ کچھ اُڑا لیا۔ بڑا پیسہ ہے اس ڈاکٹر کے پاس۔ ایمان سے پانی کے انجکشن لگا کر اکٹھا کیا ہے لیکن نوکر میرے سوا کوئی دوسرا گھر میں نہیں باغیچہ میں کھڑا ہو کر مالی پکارتا ہے۔ تو میں حاضر ہوتا ہوں۔ کھانے کے کمرے میں جب باورچی پکارتا ہے تو میں جا سامنے ہوتا ہوں۔ ڈرائنگ روم میں جب بیرہ بیرہ پکارتا ہے تب بھی مجھے جانا پڑتا ہے۔ اور جب گیراج میں شوفر کو آواز دیتا ہے تو یہی خاکسار حاضر ہوتا ہے۔ چار پانچ پوسٹیں ہیں میرے پاس اور تنخواہ صرف ایک پوسٹ کی ملتی ہے۔ کھانے پینے میں بھی کنجوس ہے مگر رات کو دودھ ضرور پیتا ہے۔ آدھے گلاس سے زیادہ نہیں۔ ایک رات میں بھرا ہوا گلاس لے کر گیا۔ دیکھ کر بولا "دودھ زیادہ ہے کم کر کے لاؤ۔"

میں گلاس لے کر تھوڑی دیر پردے کے پیچھے کھڑا رہا۔ دودھ کے دو گھونٹ بھرے اور گلاس لے گیا۔ دیکھ کر بولا اب بھی زیادہ ہے لے جاؤ اور کم کر کے لاؤ۔"

میں نے پھر پردے کے پیچھے کھڑے ہو کر بڑے بڑے گھونٹ بھر کر گلاس آدھا کر دیا اور پھر لے گیا۔ بس دیکھ کر خوش ہو گیا اور غٹا غٹ پی گیا۔

اس پر سب محفل ہنسنے لگی۔ ڈاکٹر کا ملازم پھر بولا۔ بیوی بہت ہی نیک اور شاہی طبیعت کی ہے میرا بڑا خیال رکھتی ہے مگر بازار اس کو بھی گھسا جاتے ہیں جو چیز منگواتی ہے اس میں ہاتھ مار جاتا ہوں۔ ایمان سے بائی گاڈ بہت مزے ہیں یاروں کے۔

ڈاکٹر کے ملازم نے اپنے گھر کی کہانی ختم کی تو پروفیسر صاحب کا ملازم کہنے لگا۔

میاں اپنا پروفیسر بڑا گڈ مین دی لالٹین ہے۔ مگر بی بی اللہ کی قسم اتنی تنگ دل کہ خدا بچائے چھوٹی چھوٹی چیز کے لیے بازار کے کئی کئی چکر لگواتی ہے۔ کبھی یہ چیز خراب لایا ہے بدلوا کر لاؤ۔ کبھی واپس کر کے آؤ۔ یہاں بھی اب رگ پہچان لی ہے۔ ایک دن کہنے لگی "یہ مونگ کی دال بدلوا کر لاؤ۔" میں جا کر اپنے کمرے میں حقہ پینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہی دال لے گیا اور کہا

لڑ جھگڑ کر بدلوا کر لایا ہوں۔ بس پسند آ گئی۔ ہاتھ تو ہم بھی مار لیتے ہیں چھوڑتے نہیں اور ہاں مزے کی بات ہے کہ ہر روز دو آنے کے چنے منگوا کر گھوڑے کی طرح کھاتی ہے۔

اس پر میجر کا بیرہ کہنے لگا: "ہارس پاور بڑھاتی ہو گی"

پروفیسر کا ملازم پھر کہنے لگا "میں جیبوں میں سے بھی ٹیکس نکال لیتا ہوں۔ کچھ بھی ہو بی بی ہے شوقین مزاج۔ پروفیسر تو کالج میں جھک مارتا ہے اور لونڈے گھر کا چکر کاٹتے ہیں"

اب سیٹھ صاحب کا خانساماں میجر کے بیرے سے کہنے لگا: "ارے میجر صاحب تو بھی کچھ بول۔ تیرا کیا حال ہے۔ آج ڈاکٹرنی کی آیا نہیں آئی۔ کیا ہو گیا اُسے۔ آ جاتی تو ہماری محفل رنگین ہو جاتی"

پروفیسر کا ملازم بولا "ہاں یار اُس کے آ جانے سے ہماری بھی میکسڈ پارٹی ہو جاتی ہے"

میجر کا بیرہ اپنا حال سُنانے لگا "کیا پوچھتے ہو ہمارے میجر صاحب کا۔ ملٹری لین کا آدمی ہے چوبیس گھنٹے اٹنشن رہتا ہے اور کوئیک مارچ کرتا رہتا ہے۔ کبھی بیوی سے لڑتا ہے تو اُسے بھی اٹنشن کرا دیتا ہے مگر ہے وہ بھی تیز۔ ایک دن آپس میں بول چال ہو گئی۔ میجر کے گالوں پر ایسے رنگدار ٹمکتی کلر نما ناخن مارے کہ لکیریں ڈال دیں اور میجر صاحب کی ڈبل مارچ کرا دی۔ بھاگ گیا مورچہ چھوڑ کر۔ روز لڑتے ہیں اور روز رات کو صلح ہو جاتی ہے۔ میجر رات کو کلب سے آ کر زور سے کہتا ہے میز فیر ڈارلنگ میز فیر ([illegible])، بیوی مُسکرا پڑتی ہے۔ گذشتہ سال ولایت گیا تھا میم تو نہ لا سکا کار لے آیا۔

ڈاکٹر کا ملازم بولا "میم کا امپورٹ لائسنس نہ ملا ہو گا"

سیٹھ کا خانساماں ہنس کر کہنے لگا "ہمارے صاحب لوگ ولایت جا کر یہی کام کرتے ہیں یا میم لائیں گے یا موٹر کار۔ پہلے میم کی کوشش کرتے ہیں اگر ہتھے نہ لڑے تو کار لے آتے ہیں۔ اس کے سوا تیسری چیز اُن کو نظر ہی نہیں آتی"

میجر کا بیرہ پھر کہنے لگا "گذشتہ دنوں لوٹ پڑ گئی تو کار فروخت کر دی"

ایک اور افسر کا ملازم بولا "یہ بھی صاحب لوگوں میں خاص صفت ہے پیسہ ملا تو کار لے لیں گے جب ہاتھ خالی ہوا تو بیچ دیں گے۔ ہمارے صاحب کو بھی مکان بنانے کا ایڈوانس ملا تھا۔ فوراً کار لی لیکن پچھلے مہینے بیچ دی اور اب مکان ہے نہ کار۔ دنیا کا کوئی ایڈوانس ہوگا جو اس نے نہ لیا ہو۔"

میجر کا بیرہ بولا۔ اپنے صاحب کے پلّے تو ایک پیسہ نہیں۔ ساری دنیا کے بل اس کو ادا کرنے ہوتے ہیں۔ اکثر ادھر ادھر سے ادھار لے کر گذارہ کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں تو سوائے سگریٹ چرانے کے اور کہیں ہاتھ مارنے کا موقع نہیں ملتا۔ لو پیو سگریٹ پلیر نمبر تین ہے کیا یاد کرو گے۔

سب نے ایک ایک سگریٹ لے لیا۔

اب دفتر کے سپرنٹنڈنٹ کا ملازم چھوکرا بولا "ہمارا صاحب تو نرا شو ہی شو ہے"

میجر کا بیرہ بولا "پاسنگ شو"

چھوکرا کہنے لگا "فس کلاس کپڑے پہنے۔ انگریزی ٹوپی رکھا اور دفتر چلے گئے۔ سوٹ بوٹ میں ایسا نظر آتا ہے جیسے ڈپٹی ہو، مگر اندر سے گھر کا ڈھول یا بالکل کھوکھلا جیسے بانسری ہو۔ آوا رسے چلی مگر اللہ ہی اللہ۔ ادھر تنخواہ ملی ادھر ختم ہوگئی۔ سب بٹ بٹا جاتی ہے۔ پیسے کا مت پوچھو مگر بچے جتنے چاہو گن لو۔ ختم ہونے میں نہیں آتے پتہ نہیں گھر میں مل لگی ہوئی ہے۔ ہر سال فلموں کی طرح نیا چہرہ دیکھ لو۔ ہمارا تھوڑا بہت الاونس سبزی میں سے نکل آتا ہے ورنہ اور کوئی سکوپ نہیں۔ بیوی کو سینما دیکھنے کا بہت شوق ہے مگر جب سینما جاتی ہے تو کمروں کو تالا لگا جاتی ہے۔ گھی چینی اور دالیں سب تالے میں۔ مجھے پکانے کے لیے ناپ تول کر دے جاتی ہے۔ بیوی کیا ہے راشن کنٹرولر ہے۔ مگر یار بھی موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ موقع ملا اور مال غائب۔

آخر میں سیٹھ آلو جی بالو جی اینڈ کمپنی کے مالک کا خانساماں بولا "بھئی اپنی تو چین سے

گذرتی ہے۔ سیٹھ سارا دن بزنس میں پھنسا رہتا ہے۔ سیٹھانی پان کھا چھوڑتی ہے۔ لیکن بڑی ہوشیار ہے۔ بڑا گھر کا دھڑکا رکھتی ہے۔ اُس کو ڈانٹ اس کو ڈپٹ۔ مگر ہم کب قابو آتے ہیں۔ ہم پر تو ویسے ہی مہربان ہے۔ لونڈیاں بڑی تیز ہیں۔ کالج جاتی ہیں۔ ایک بڑی سے چھوٹی مجھ سے بڑی باتیں کرتی ہے۔ دو دفعہ فیل ہو چکی ہے ان شاء اللہ تیسری بار بھی فیل ہو گی۔ ریڈیو کی شوقین ہے۔ فلمی گانے سنتی رہتی ہے۔ قتل کرتی ہے قتل۔ جس سے شادی ہو گی اُس کو تو زندہ شہید کر دے گی۔ سیٹھ کے پاس پیسہ بے شمار ہے۔ بزنس کے سلسلہ میں افسروں سے تعلق رکھتا ہے۔ آج کسی افسر کا کھانا ہے تو کل کسی افسر کا۔ دعوتوں کا چکر لگا رہتا ہے، افسروں کو پیسہ بھی چڑھا دیتا ہے بڑے طریقے سے۔ فلیش میں جان جان کر ہارتا ہے۔ بڑا گھاگ ہے۔ ارے میجر صاحب کل کھانا ہمارے ہاں کھاتا۔ کل کسی افسر کی دعوت ہے اور تو بھی ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر صاحب کا ملازم بولا: "ارے اتنے آدمیوں کا کھانا بچے گا کیسے؟"

خانساماں بولا: "بچنے کا کیا سوال ہے۔ میں پہلے بہت سا کھانا تم لوگوں کے لیے نکال لوں گا۔ اگر سیٹھ بزنس کے سلسلہ میں افسروں کی دعوت کر سکتا ہے تو میں تمہاری دعوت کیوں نہ کر سکوں گا۔ ہمیں بھی آپس میں کبھی کام پڑ سکتا ہے۔ اچھا بھئی کل آنا ضرور تر مال ملے گا۔"

انٹرویو بورڈ

جس دن سے انٹرویو بورڈ قائم ہوئے ہیں۔ اُسی دن سے قابل ہوشیار مسکین یتیم قسم کے امیدواروں کو جو اکثر و بیشتر ناکام رہتے ہیں ہمیشہ شکایت رہی ہے کہ بورڈ کے ارکان ان امیدواروں کو منتخب کرتے ہیں جن کے پاس سفارشی چٹھی ہوتی ہے" یا پھر کسی بڑے آدمی کے داماد۔ سالے یا عزیز ہوتے ہیں اور وہ سب کے سب انٹرویو سے پہلے ہی چُن لیے جاتے ہیں۔ باقی امیدواروں کا انٹرویو صرف دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی خاطر لیا جاتا ہے۔ یہ شکایت کس حد تک درست ہے۔ اس کا اندازہ لگانا ہو تو آپ فرض کر لیجیے کہ ایک بہت بڑی ٹیکسٹائل مل میں ویلفیئر، فنانس اور ایڈمنسٹریٹو افسروں کی چند اسامیاں خالی ہیں۔ انتخاب کے لیے ایک انٹرویو بورڈ جلوہ افروز ہے آج امیدواروں کا انٹرویو ہے۔ بورڈ تین ممبروں پر مشتمل ہے۔ یہ تینوں ممبر مل کے ڈائریکٹر بھی ہیں۔ بورڈ کے صدر جن کی عمر پچاس سال کے قریب ہے سر کے بالوں سے بے نیاز ہیں۔ چہرے سے ذہانت سے زیادہ چالاکی ٹپکتی ہے۔ ایک نوجوان ممبر صدر کے دائیں جانب بیٹھے ہیں۔ عینک لگی ہوئی۔ انگریزی لباس زیب تن کیے داڑھی مونچھ سے فارغ ہیں۔ تیسرے ممبر صدر صاحب کے اُلٹے ہاتھ تشریف فرما ہیں اچکن پہنے اور خضر حیاتی پگڑی باندھے جس کا طرہ چھت کے پنکھے تک پہنچتا ہے اور پنکھے کی ہوا سے اس طرح لہرا رہا ہے جیسے کوئی ناگ پھن پھیلائے جھوم رہا ہو۔

ان تینوں ممبروں کے سامنے چند کاغذات بے ترتیبی سے پڑے ہوئے ہیں

امیدواروں کی عرضیاں اور سرٹیفکیٹ وغیرہ۔ ایک کے سامنے ایک کاغذ پر چند نام لکھے ہوئے ہیں جن کے سامنے خاص نشان لگے ہوئے ہیں۔

چند امیدوار کمرے کے باہر برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور باریابی کے لیے خمیازہ انتظار کھینچ رہے ہیں۔ خدا خدا کر کے انٹرویو شروع ہوتا ہے۔ ایک امیدوار کی طلبی ہوتی ہے۔ اس کا نام پوچھ کر مخصوص ناموں کے کاغذ پر ڈھونڈ کر نشان لگا دیا جاتا ہے اور پھر سوالات شروع ہوتے ہیں۔

سوال :- آپ کی تعلیم۔

امیدوار :- میٹرک یعنی دسویں پاس۔

سوال :- روس کا دارالحکومت بتایئے۔

امیدوار :- روس کا دارالحکومت مالوٹوف۔

سوال :- ماسکو پر کچھ روشنی ڈالیے۔

امیدوار :- وار جنگ میں روس کا سفیر ہے۔

سوال :- اچھا بتایئے دس کو کس سے ضرب دیں کہ حاصل ضرب چالیس ہو۔

امیدوار :- ہتھوڑے سے۔

سوال :- اگر ہم کو ۳ سے ضرب دے کر ۵ سے تقسیم کیا جائے تو ہمیشہ ۲ بچتے ہیں۔ کبھی ۳ بھی بچ سکتے ہیں۔

امیدوار :- اگر غلط ضرب دے کر غلط تقسیم کیا جائے تو ۳ بھی بچ سکتے ہیں۔

سوال :- کسی بڑے رشتہ دار کا نام لیجیے۔

امیدوار :- بہت سے ہیں کس کا نام لوں۔

سوال :- کسی ایک کا نام لیجیے۔

امیدوار :- اپنے خاندان میں بیس پچیس جنگ بہادر ہیں اور اتنے ہی نواز جنگ

اور آصف دولہ ہیں۔

صدر :۔ بہت خوب آپ جا سکتے ہیں۔

امیدوار کے جانے کے بعد صاحب صدر نے امیدوار کی قابلیت کو نظر انداز کرتے ہوئے اور جنگ بہادروں اور دولوں کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

صدر :۔ اس امیدوار کو ضرور منتخب کر لینا چاہیے، اس سے مل کے بہت سے کام نکلیں گے۔ امپورٹ لائسنس کے حصول میں بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

دونوں ممبروں کو اتفاق کرنا پڑا۔

ایک اور امیدوار حاضر ہوتا ہے اس سے بھی کچھ اس قسم کے سوالات کیے جاتے ہیں۔

سوال :۔ آپ کا ایک چچا خان بہادر بھی ہے۔

امیدوار :۔ جی ہاں بہت پرانا خان بہادر ہے۔

سوال :۔ بہت پرانا۔ کب سے۔

امیدوار :۔ میرے پیدا ہونے سے بھی بہت پہلے۔

سوال :۔ آپ کی عمر۔

امیدوار :۔ چھبیس سال۔

سوال :۔ آپ کے چچا کی عمر۔

امیدوار :۔ چالیس سال۔

سوال :۔ تو کیا تیرہ چودہ سال کی عمر میں خان بہادری کا خطاب ملا تھا۔ کیا نام ہے اُن کا۔

امیدوار :۔ جی نام ہے خان بہادر۔

سوال :۔ خان بہادر کیا۔ پورا نام بتائیے۔

امیدوار :- جناب پورا نام ہی خاں بہادر ہے۔ پیدائشی خاں بہادر۔ ہیں۔ ڈپی بازار میں پرچون کی دکان کرتے ہیں۔

اس امیدوار کے جانے کے بعد ایک ممبر نے اظہار خیال فرمایا۔

ممبر :- اس کے آگے پیچھے کوئی بھی نہیں۔ اور یہ یتیم خانہ تو ہے نہیں۔ اسے منتخب کرنے سے کیا فائدہ۔

صدر :- لڑکا ذہین دکھائی دیتا ہے۔ مگر نام کاٹ دیجیے۔

ایک اور سفارشی قسم کے امیدوار سے انٹرویو ہوتا ہے۔

سوال :- اگر ایک گھڑی ایک دن میں پانچ منٹ آگے چلتی ہو تو چھ ماہ میں کتنی آگے جائے گی۔

امیدوار :- صرف ڈیڑھ دن۔

صدر :- شاباش۔

سوال :- چند ایسی نامور ہستیوں کے نام لیجیے جن کا نعم البدل ملنا ناممکن ہو۔

امیدوار :- ٹینس میں فتح دار۔ کرکٹ میں کپتان کی حیثیت سے کاردار۔ ایکٹرسوں میں صبیحہ۔ ایکٹروں میں سنتوش کمار اور ہیرا پھیری میں ہم سب۔

سوال :- آپ مرغیارہ خاں ایم ایل اے کے بڑے لڑکے ہیں۔

امیدوار :- جی نہیں چھوٹا بھائی ہوں۔

صدر :- ایک ہی بات ہے۔

یہ صاحب بھی منتخب ہو جاتے ہیں۔

ایک اور منتخب امیدوار تشریف لائے۔ انھوں نے بڑے زناٹے کے جواب دیے۔

سوال :- بحر اوقیانوس کی گہرائی کیا ہے۔

امیدوار:۔ بالکل ٹھیک تو کوئی پٹواری ہی بتا سکتا ہے ویسے بحر الکاہل کی گہرائی سے دس گز کم ہے۔

سوال:۔ اور بحر الکاہل کی گہرائی۔

امیدوار:۔ بحر اوقیانوس کی گہرائی سے دس گز زیادہ۔

سوال:۔ علامہ اقبال کے کلام سے قوم نے کیا فائدہ اُٹھایا۔

امیدوار:۔ علامہ مرحوم کے کلام کے جملہ حقوق قوالوں کے نام محفوظ ہیں اور قوم ان کے کلام کی خوب قوالی سنتی ہے جس سے اُن کی روح طبلے کی تھاپ کی طرح بے چین رہتی ہے

سوال:۔ آپ سر اکبر کے قریب ہی رہتے ہیں۔

امیدوار:۔ میں اُن کے ساتھ ہی رہتا ہوں۔ وہ میرے چچا ہیں۔

امیدوار کے جانے کے بعد صدر صاحب نے فرمایا:

صدر:۔ سر اکبر سے میرے خاص مراسم ہیں ان کے پہلے بھی مل پر بہت احسان ہیں اس لڑکے کا انتخاب ضروری ہے مسٹر نور عالم سردار حضور عالم کے سی ایس آئی کا لڑکا انٹرویو کے لیے نہیں آیا مجھے سردار صاحب کا فون آ گیا تھا کہ لڑکا ملتان شکار کھیلنے گیا ہے جو اسامی اُس کے لیے وقف تھی ہم اسے دے ہی جائے۔ انٹرویو کی ضرورت نہیں۔

باقی دونوں ممبران نے ہاں میں ہاں ملائی۔

جو امیدوار سفارشی تھے اور جن کو یقین تھا کہ وہ پہلے منتخب ہو چکے ہیں وہ تو ہنستے کھیلتے گھر روانہ ہوئے۔ مایوس اور غیر سفارشی امیدوار کھڑے باتیں کرنے لگے اور بورڈ کے ارکان پر تبصرہ کرنے لگے۔

ایک نے رائے کا اظہار کیا: "یہ سب آپس میں ملے ہوئے ہیں جن کو رکھنا ہوتا ہے انہیں پہلے ہی منتخب کر لیا جاتا ہے اُن کے لیے انٹرویو کی کوئی قید نہیں وہ تو گھر بیٹھے بٹھائے

بھی لیے جاتے ہیں"۔

دوسرا رونے لگا "ہم تو صرف کارروائی پوری کرنے اور خانہ پری کے لیے بلائے جاتے ہیں۔ ہمارا نمبر تو تب آتا اگر کسی خان بہادر کے لڑکے یا کسی افسر کے داماد یا سالے ہوتے یا پھر کوئی زبردست سفارش ہوتی۔ مگر یہ سب آئیں کہاں سے"۔

ایک اور امیدوار غصے میں بولا "پوچھتے ہیں کسی بڑے رشتہ دار کا نام بتاؤ۔ میں پوچھتا ہوں اگر ان کے باپ کا نام پوچھا جائے تو معلوم ہو کہ یہ خود کتنے پانی میں ہیں۔ وہ جو گنجا صدر ہے نا خدا کی قسم تیلی کا لڑکا ہے اور وہ لونڈا سا سوٹ بوٹ والا اسی تیلی کا رشتہ دار ہے اور وہ جو تیسرا ہے طرہ باز ذات کا بڑھئی ہے اس کا چھوٹا بھائی ابھی تک بڑھئی کا کام کرتا ہے محلہ میر وارث شاہ کے قریب ایک بہت بڑا احاطہ گھیر رکھا ہے اور وہاں آج کل رندے چلتے ہیں۔ اپنی تو یہ حالت اور دوسروں کے رشتہ داروں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ اللہ کی شان"۔

دوسرے صاحب تیوری چڑھا کر بولے "اور اگر ہم کوئی سوال کریں جواب دینا تو ایک طرف شاید سوال ہی نہ سمجھ سکیں۔ سوائے اس لڑکے کے باقی دونوں آٹھویں فیل ہیں۔ اور وہ لڑکا دسویں فیل ہے"۔

ایک دُبلے صاحب نے انکشاف کیا "صدر صاحب مجھے کہنے لگے تمہیں نوکری تو دیدیں کیونکہ تم موزوں ترین آدمی ہو لیکن دقت یہ ہے کہ تمہارا باپ گزیٹڈ افسر نہیں ہے میں نے عرض کیا جناب فرض کیا اگر میرا باپ گزیٹڈ افسر ہوتا اور میں نالائق ہوتا تو پھر آپ مجھے ملازمت دے دیتے۔ آپ میری تعلیم اور قابلیت دیکھیے۔ میرے باپ کی حیثیت کو چھوڑیے کام مجھے کرنا ہے یا میرے باپ کو۔ یہ سُن کر چپ ہو گیا میرا مُنہ دیکھنے لگا اور پھر دروازہ کی طرف اشارہ کیا۔ یعنی مطلب یہ کہ وہ ہے باہر کا راستہ۔

جتنے کھڑے تھے سب ہنس پڑے جیسے ان کو روحانی مسرت ہوئی ہو۔

شہر ساول پنڈی

دو سو سال کا عرصہ گذرا کہ سلطنت مولاداد اچانک عالم وجود میں آگئی۔ رات کو لوگ مزے سے لمبی تان کر سوئے۔ صبح اُٹھے تو دیکھا کہ نقشہ ہی بدلا ہوا ہے۔ ملک بالکل آزاد ہو گیا ہے اور اُس کا نام بھی بدلا ہوا ہے۔ اس ملک کی آبادی بہت خوشحال ہے اسی فیصد باشندے وزیر یا سفیر ہیں۔ دس فی صد لوگ انگریزی بولتے اور لکھتے ہیں ساٹھ فیصدی اُردو لکھتے ہیں اور سو فیصدی صرف اردو سمجھتے ہیں۔

دو سو سال گذر چکے ہیں لیکن ابھی تک ملک کو نئی چیزیں ایجاد کرنے، عمارات وغیرہ بنانے یا صنعت کو فروغ دینے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ کیونکہ ابھی اُن ایجادات و عمارات وغیرہ کو ٹھکانے لگانے کا مرحلہ درپیش ہے جو سلطنت مولاداد کے عالم وجود میں آنے سے پہلے موجود تھیں۔ ان سے نبٹنے کے بعد سوچا جائے گا کہ اب ملک کو خود کیا کیا چیزیں بنانی ہیں۔ ویسے اس ملک میں کئی چیزوں کی افراط ہے مثلاً گرمی کی یہاں اس قدر فراوانی ہے کہ گرم مصالحہ کھانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ بارش اس کثرت سے ہوتی ہے کہ شہر میں کشتی رانی کے پیشے کو آسانی سے فروغ دیا جا سکتا ہے۔ سیلاب کے دنوں میں تیرتے ہوئے مکانات کشمیر کی جھیل ڈل میں رواں دواں شکاروں کا سماں باندھ دیتے ہیں۔

یہاں کی خاص پیداوار فقیر، سائیس اور مست ملنگ ہیں۔ اس پیداوار کو اگر دساور بھی بھیجا جائے تو اس سے دوگنی پھر پیدا ہو جاتی ہے۔

بچوں کی پیداوار میں بھی دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی ہے مگر حکومت نے بچوں کو دساور بھیجنے پر پابندی لگا رکھی ہے مگر گلیوں میں گلی ڈنڈا کھیلنے پر کوئی پابندی نہیں۔

شہر ساول پنڈی اس ملک کا تیسرا بڑا شہر ہے۔ اس شہر میں ہر قسم کے لوگ آباد ہیں۔ شہر کی عام حالت کے متعلق وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ملک کی حالت سے اگر بہتر نہیں تو کم بھی نہیں۔ شہر کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد ہے جو دن رات اسی کوشش میں رہتی ہے کہ جہاں میدان ہے وہاں تالاب بنا دیا جائے۔ جہاں تالاب ہے وہاں دریا بنا دیا جائے تاکہ عوام نیکی کر کے اس میں ڈال سکیں۔ اور جہاں سڑک میں چھوٹے چھوٹے گڑھے ہیں وہاں کنوئیں کھدوا دیے جائیں تاکہ اگر کبھی خودکشی کی ضرورت محسوس ہو تو ہر جگہ کنواں میسر ہو۔

شہر کی کمیٹی میں ایک خاص وصف ہے وہ یہ کہ جو سڑکیں اچھی ہوتی ہیں اُن کو توڑ تاڑ کر مرمت کرواتی رہتی ہے تاکہ وہ اور زیادہ پختہ ہو جائیں۔ اور جو سڑکیں بالکل شکستہ حالت میں ہیں اُن کی طرف جان بوجھ کر توجہ نہیں دی جاتی بلکہ اُن کو اور شکستہ تر ہونے کا موقع دیتی ہے تاکہ پھر یک بارگی مرمت کرا دی جائے۔ دو سو سال سے سڑکیں شکستہ تر ہوتی جا رہی ہیں مگر ابھی تک کمیٹی کی حسبِ منشا نہیں ہوئیں ورنہ اُن کی مرمت کی طرف غور کیا جاتا۔

بارش کے دنوں میں جب ان ٹوٹی پھوٹی سڑکوں سے گذرنے کا اتفاق ہو تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انسان جزیروں کے درمیان سے گذر رہا ہے۔

شہر کے لوگ چونکہ نسبتاً زیادہ دور اندیش ہوتے ہیں اس لیے سڑکوں کی مرمت کے بارے میں کم شور مچاتے ہیں۔ مرمت ہو جانے سے اُنہیں بہت نقصان پہنچتا ہے۔ وہ اس طرح کہ ہمارے یہاں سڑکوں پر بہت بڑے بڑے گڑھے بھی ہوتے ہیں جو برسات کے دنوں میں پانی سے بھر جاتے ہیں۔ ان گڑھوں میں لوگ خود

نہا سکتے ہیں۔ اپنے بچوں کو نہلا سکتے ہیں۔ کپڑے دھو سکتے ہیں۔ گائیں بھینسیں بھی ان میں پانی پی سکتی ہیں۔ ویسے کوشش کی جائے تو ان میں مچھلیاں بھی پکڑی جا سکتی ہیں ان گڑھوں میں بیشتر سائیکل سوار اپنی اپنی سائیکل سمیت کود جاتے ہیں اور اس طرح وہ خود بھی نہا لیتے ہیں اور اُن کی سائیکل بھی مفت میں "اوورہال" ہو جاتی ہے۔ اگر خدانخواستہ کمیٹی والے ان گڑھوں کو کہیں پُر کروا دیں تو سوچیے کہ اہل شہر کو کتنے فائدوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔

جب کبھی کسی طرف سے کسی سڑک کی مرمت کے لیے شور اُٹھتا ہے تو اُس سڑک کی مرمت کا فوراً بندوبست کر دیا جاتا ہے۔ مرمت طلب سڑک کے بائیں کنارے پر پتھروں کے ڈھیر لگا دیے جاتے ہیں لوگ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اب سڑک کی مرمت ہو جائے گی۔ یہ پتھروں کے ڈھیر تین چار ماہ تک اسی طرح پڑے رہتے ہیں۔ جب پھر زیادہ دہائی کا شور اُٹھتا ہے تو ان پتھر کے ڈھیروں کو بائیں طرف سے اُٹھا کر دائیں طرف کر دیا جاتا ہے۔ اس ہلچل سے لوگ پھر خاموش ہو جاتے ہیں کہ بس اب سڑک کی مرمت ہوئی کہ ہوئی۔ اسی حالت میں تین چار ماہ پھر گذر جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد ان پتھروں کو اُٹھوا کر کسی اور سڑک کے کنارے پھینکوا دیا جاتا ہے کیونکہ اب اس سڑک کے لوگ زیادہ شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ غرض اسی طریقہ سے میونسپلٹی والے بغیر پتھر بچھائے بیشتر سڑکوں کی مرمت کرتے چلے جاتے ہیں۔

اس میونسپلٹی کا ایک حاکم بھی ہوتا ہے جس کو صدر کا خطاب دیا جاتا ہے جب وہ بہت اچھا انتظام کرنے لگتا ہے تو ملک کے مفاد کے پیش نظر اُس کو ملک یا صوبہ کا وزیر بنا دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل شہر میونسپلٹی کا ممبر بننے کی بہ نسبت صدر بننا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

شہر کے بازار بارونق ہیں۔ گاہکوں سے زیادہ دکاندار ہیں جو ایک دوسرے

کی کھال اُتارنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ بازار میں ہر دوسری دکان چائے کی دوکان ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگ چائے کے حد سے زیادہ شائق ہیں اور چائے بھی خوب بنائی جاتی ہے اور ملتی بھی بغیر پرمٹ کے ہے۔

پبلک کی سہولت کے لیے کمیٹی والوں نے بازار میں کہیں بھی کوڑے دان نہیں رکھے کہ لوگ کوڑے دان کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔ چنانچہ عام اجازت ہے کہ بازار میں جو چیز جہاں چاہے پھینکی جا سکتی ہے۔ اس لیے بازار میں کاغذ۔ پھلوں کے چھلکے وغیرہ جابجا پڑے ہوئے نظر آتے ہیں اور جو پڑے پڑے ہی خشک ہو جاتے ہیں۔

کمیٹی کے خاکروب وقت کے بڑے پابند ہیں۔ روز دوپہر کو کاروبار کے وقت بازار میں چھلکوں اور کاغذوں کو ادھر سے اُدھر اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ شہر میں صبح سویرے جھاڑو دینا منحوس خیال کیا جاتا ہے،

جب کسی سڑک کی مکمل صفائی کی ضرورت پڑتی ہے تو اہل کمیٹی وہ سڑک کسی ممبر کو الاٹ کر دیتے ہیں اور جب وہ ممبر سڑک کو اپنے خرچ سے صاف کرا دیتا ہے اور جگہ جگہ پر اپنے نام کے بورڈ لگوا دیتا ہے تو پھر سڑک کی الاٹمنٹ منسوخ کر دی جاتی ہے اس طرح سانپ بھی مر جاتا ہے اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹتی۔ مقصود تو سڑک کی صفائی ہوتی ہے۔

شہر میں ہر خالص چیز نخالص اور ہر نخالص چیز خالص ملتی ہے۔ ایک عجیب بات اور بھی ہے وہ یہ کہ بھینس تو خالص ہوتی ہے مگر دودھ نخالص ملتا ہے۔ تانگوں کے گھوڑے نخالص نظر آتے ہیں مگر رفتار خالص ہوتی ہے۔

شہر کے حاکم لوگ اکثر بڑے دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ جن دنوں کپڑے کی قلت بڑھ گئی تھی تو لوگوں نے چلانا شروع کر دیا کہ راشن کی دکان پر کپڑا نہیں ملتا اور قطار در قطار کھڑے رہنے کے بعد نامراد واپس لوٹنا پڑتا ہے۔ اگر خوش قسمتی سے کپڑا

مل بھی جاتا ہے تو پہنے ہوئے کپڑے وصینا کاشتی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ اس مصیبت سے لوگوں کو نجات دلانے کے لیے حاکموں نے ایک منصوبہ تیار کیا۔ پہلے لوگوں کو سمجھایا کہ بغیر کپڑے کے بھی زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ انسان برہنہ پیدا ہوا ہے اور برہنہ ہی اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو گا۔ اور اگر دنیا میں اپنے بھائیوں کے سامنے چند روز برہنہ رہ لیا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ لیکن یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اہل شہر ننگا رہنے کے عادی نہیں پہلے ان کی طبیعت اس طرف مائل کرنا چاہیے۔ چنانچہ حاکموں نے شہر کے اکثر بازاروں میں چند آدمی چھوڑ دیے جو الف ننگے بازاروں میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے تھے۔ ان آدمیوں کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ یہ سرکاری آدمی تھے اور اس بات کی تنخواہ پاتے تھے۔ حاکموں کو امید تھی کہ ان سرکاری آدمیوں کو اس برہنہ حالت میں دیکھ کر پبلک کی جھجک دور ہو جائے گی اور آہستہ آہستہ وہ بھی بغیر کپڑوں کے بازاروں میں آنا شروع کر دیں گے اور کپڑے کی قلت کا سوال ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

شہر میں سواری دو قسم کی ہے۔ ایک بس سروس اور دوسری تانگہ۔ بس سروس ایک لاجواب چلتا پھرتا آرکسٹرا ہے۔ بس میں سفر کرتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمام ملکوں کے ملے جلے ترانے بج رہے ہیں۔ دس منٹ میں جسم کا ہر حصہ دھنک کر رکھ دیتی ہے۔ اس لیے جس کسی کو بدہضمی کی شکایت ہو۔ ڈاکٹر لوگ نسخہ میں لکھ دیتے ہیں کہ پانچ منٹ لوکل بس میں سفر کرو۔ یہاں کے تانگے بہت خوبصورت اور شاندار ہوتے ہیں اور تانگے والے تانگے سے زیادہ شاندار۔ ان میں خاص صفت یہ ہے کہ گھوڑے بغیر آگے پیچھے دیکھے تانگے کو دوڑ لیتے ہیں۔ اگر ایسے موقعہ پر کوئی سائیکل سوار تانگے کے نیچے آنے سے بچ جائے تو یہ سائیکل والے کی بدقسمتی ہے تانگے والے کا کوئی قصور نہیں۔

راولپنڈی میں چند قابلِ دید مقامات اور سیرگاہیں بھی ہیں۔ دریائے لئی کے کنارے ایک باغ ہے جس کو شہر کا سب سے بڑا باغ تصور کیا جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ باغ کم اور میدان زیادہ ہے۔ اس باغ میں جگہ جگہ نوٹس بورڈ لگے ہوئے ہیں جن پہ لکھا ہے "یہاں پھول توڑنا منع ہے"۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوٹس بورڈ لگانے سے پہلے ہی کوئی منچلا تمام پھول توڑ کر لے جا چکا تھا۔ یہ باغ شہر کی طرف پھیلتا چلا جا رہا تھا۔ اس لیے میونسپلٹی نے جس جگہ باغ کی حد شہر کی طرف ختم ہوتی ہے وہاں پہ ایک دیوار بنا کر باغ کو شہر کی طرف پھیلنے سے روک دیا ہے۔ باغ کے دونوں سروں پہ ایک ایک پھاٹک لگا کر راستہ بند کر دیا ہے کہ کہیں شہر پھیل کر باغ میں نہ آن گھسے۔ باغ میں ایک ننگا سا میدان ہے جہاں اکثر کرکٹ کھیلی جاتی ہے۔ عید کی نماز بھی اسی میدان میں ہوتی ہے۔ عید سے ایک دن پہلے تمام میدان کو کھدوا دیا جاتا ہے تاکہ مٹی کے ڈھیلے اور پتھر زمین سے باہر نکل آئیں۔ اہلِ شہر ان ڈھیلوں اور پتھروں پہ جا نماز بچھا کر نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ پتھر اور ڈھیلے سوائے چبھنے کے اور کوئی تکلیف نہیں دیتے۔ میونسپلٹی کے خیال میں ایسی نماز سے دوگنا ثواب ہوتا ہے۔

باغ میں میدان کی توسیع کے سلسلہ میں سڑک کو اس طریقے سے کھدوایا دیا گیا ہے کہ آدھی تو میدان میں شامل ہو گئی ہے اور آدھی ویسے ہی کھڑی ہے اور تقریباً چار پانچ فٹ کی بلندی سے میدان میں گرتی ہے۔ باغ میں بجلی کا انتظام ابھی نہیں کیا گیا اس لیے روشنی کا کام صرف چاند سے لیا جاتا ہے۔ اکثر اندھیری راتوں میں لوگ اور سائیکل سوار اپنی نادانی کی وجہ سے ٹوٹی ہوئی سڑک پر سے میدان میں جا گرتے ہیں اور جب اُن کی آنکھ کھلتی ہے تو ہسپتال میں ہوتے ہیں۔ سڑک کو اس حالت میں کیوں چھوڑ دیا گیا تحقیق پر معلوم ہوا کہ یہ سکیم کمیٹی نے ہسپتال کا خرچ نکالنے کے لیے بنائی ہے جو مفید ثابت ہو رہی ہے۔

باغ کے ایک کونے میں مندر، مسجد اور گوردوارہ نما ایک نئے وقتوں کی تاریخی عمارت بھی ہے۔ یہ عمارت اس ملک کے بڑے رہنما کی یادگار ہے۔ اس عمارت کو جس طرف سے بھی دیکھا جائے ایک جیسی نظر آتی ہے۔ اس عمارت کے بارہ دروازے ہیں لیکن تمام کھلے ہیں۔ کواڑ شاید اسی لیے نہیں لگائے گئے کہ کوئی مہاجن کنبہ اس میں داخل ہو کر کواڑ بند کر کے قبضہ نہ جما لے۔ لاہور کی شاہی مسجد اور مقبرہ جہانگیر کے متعلق مشہور ہے کہ ان میں سے کسی عمارت کے کسی مینار پر چڑھ کر دوسری عمارت کے مینار دیکھے جائیں تو تین ہی نظر آتے ہیں۔ یہی خوبی اس عمارت میں بھی رکھی گئی ہے۔ آپ کسی دروازے میں کھڑے ہو کر دیکھیں تو آپ کو گیارہ دروازے نظر آئیں گے۔ ایک غائب ہو جائے گا۔ اور اگر چھت پر کھڑے ہو کر دیکھیں تو سب دروازے غائب ہو جائیں گے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ جس کاریگر نے جہانگیر کا مقبرہ یا بادشاہی مسجد بنائی تھی یہ عمارت اُس کاریگر کی اولاد میں سے کسی نے بنائی ہے۔ اس عمارت کی تعمیر میں اتنا عرصہ صرف ہوا ہے جتنا تاج محل کی تعمیر میں صرف ہوا تھا اور عمارت کی جسامت کے مطابق لاگت تاج محل سے ڈھائی آنے زیادہ ہی آئی ہے۔

اس عمارت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ دن ہو یا رات اس پر ایک جیسی تاریکی اور اداسی چھائی رہتی ہے۔ یہ بہار، تاج محل کی طرح صرف چاندنی رات پر ہی منحصر نہیں۔ سیاحوں کی بدقسمتی ہے کہ اس شہر میں آ کر اس عمارت کو دیکھنے کا شرف حاصل نہیں کرتے۔ اس لیے میونسپلٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کو اٹھوا کر ملک کے عجائب گھر میں رکھوا دیا جائے۔ تاکہ سیاح لوگ اس کو دیکھنے پر مجبور ہو جائیں۔

باغ کے سامنے سڑک عبور کر کے دیکھا جائے تو ایک اور چھوٹا سا باغ نظر آئے گا۔ اس باغ کا نام یاسمین باغ ہے۔ اس باغ سے بڑا اس کا نام ہے۔ یہ اپنی طرز کا تمام ملک میں واحد باغ ہے۔ ڈیڑھ گز چوڑا اور دس گز لمبا ہے لیکن اس کی

بلندی کی کوئی انتہا نہیں۔ آسمان تک جاتی ہے۔ اس باغ کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس میں پھل اور پھول کا کوئی درخت نہیں۔ گھاس ہی گھاس ہے۔ باغ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

اس شہر کے وسط میں دریائے لئی بہتا ہے۔ تمام شہر کی سبزیاں جو پکنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ اس میں بہتی ہوئی نظر آئیں گی۔ ٹین کے ڈبے پھٹے پرانے کپڑے شہر کی کھاد اس دریا کی زینت ہے۔ اس پاک اور شفاف پانی سے تمام اہل شہر کے کپڑے دھوئے جاتے ہیں۔ جن کو پہن کر جمعہ کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ دھوبی کپڑوں کو کلف نہیں دیتے۔ کلف دھوتے ہوئے خود بخود کپڑوں میں آجاتا ہے کیونکہ اس کے پانی میں لئی بھی شامل ہے۔ اسی مناسبت سے اس کو دریائے لئی کہتے ہیں شہر راولپنڈی دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس شہر میں ایک خوبی ہے کہ اگر اس کو دیکھ لیا جائے تو اس سے کچھ حرج نہیں ہوتا اور اگر نہ دیکھا جائے تب بھی کچھ حرج نہیں ہوتا۔ یہ خوبی دوسرے شہروں میں ہرگز نہیں۔

اندھیرے میں

سلیم اور رومیش ہم عمر دوست اور کلاس فیلو شام کو سیر کے لیے اکٹھے جاتے ہیں
ایک شام سورج غروب ہو رہا ہے دیکھتے ہی دیکھتے کالی گھٹائیں چھا جاتی ہیں
سرد ہوا چلنے لگتی ہے اور اندھیرا چھانے لگتا ہے۔

سلیم۔ رومیش ہم بہت دور نکل آئے۔

رومیش۔ ہاں باتوں باتوں میں پتہ بھی نہیں چلا۔ اچھا واپس چلنا چاہیے۔

(دونوں واپس ہوتے ہیں)

سلیم۔ آج تیجا سنگھ کمبخت نہ آیا۔

رومیش۔ ہوا کتنی ٹھنڈی ہے۔ اچھا تو پھر کیا ہوا۔

سلیم۔ ہونا کیا تھا۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہی تھی۔ اور میں اوپر جا رہا تھا مجھے شرارت جو سوجھی تو دونوں ہاتھ پھیلا دیے۔

رومیش۔ اچھا پھر۔

سلیم۔ پھر کیا۔ وہ جھجکی نہ گھبرائی میرے بازوؤں کے درمیان آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کے کپڑوں سے گندھک کی تیز خوشبو آ رہی تھی۔ کیونکہ لیبارٹری سے آ رہی تھی۔

رومیش۔ پھر۔

سلیم۔ میں بڑی دیر تک گندھک سونگھتا رہا۔

رومیش ۔ پھر تم نے کیا کیا۔

سلیم ۔ مجھے کچھ کرنے کا اُس نے موقع نہیں دیا۔ کچھ خود ہی کر دیا۔

رومیش ۔ وہ کیا۔

سلیم ۔ میرے ہونٹوں پر اپنا نوکدار ناک رکھ دیا۔

رومیش ۔ سلیم ۔ محبت تو مجھے بھی نرگس سے بہت تھی ۔ مگر جب میں نے دیکھا کہ تم اُس پر اپنی جان نچھاور کرتے ہو تو میں نے اپنی محبت کا گلا گھونٹ دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہماری دوستی میں فرق آئے۔

سلیم ۔ اور اگر مجھے ذرا سا بھی علم ہوتا تو میں تمہارے حق میں دستبردار ہو جاتا.... ذرا تیز قدم ۔ بوندیں پڑنے لگی ہیں ۔ راستے میں کوئی ایسی جگہ بھی تو نہیں جہاں ذرا پناہ لی جائے۔

رومیش ۔ تھوڑی دور چونگی کا ایک ویران کمرہ ہے جہاں کبھی ٹیکس وکیس لیتے ہوں گے اگر بارش تیز ہوئی تو وہاں رُک جائیں گے۔

سلیم ۔ اس سے پہلے تو ہم اس کمرہ تک بھی نہ آیا کرتے تھے ۔ آج بہت دور نکل آئے یہ سب سالی نرگس کی بدولت ہے۔

رومیش ۔ تیجا سنگھ نہ جانے آج کہاں مر گیا کبھی ناغہ نہ کرتا تھا۔ اس کے بغیر تو سیر کا لطف ہی نہیں وہ بھی کبھی مس خورشید پر اپنے الفاظ میں "اڑنگ بڑنگ" ہو گیا تھا۔

سلیم ۔ بیچارے کو کام پڑ گیا ہو گا۔

رومیش ۔ لو بھئی سلیم ۔ اب تو بھاگنا ہی پڑے گا ۔ بارش تیز ہو گئی۔

سلیم ۔ ہاں وہ دیکھو کمرہ بھی قریب ہی ہے ۔ چلو بھاگو۔

(دونوں دوڑتے ہیں ۔ کمرے میں آکر ہانپنے لگتے ہیں)

سلیم ۔ اوہ کتنا سانس چڑھ گیا۔

رومیش ۔ اوہ اندھیرا کتنا سخت ہے ۔ یہ کمرہ گندہ بھی بہت ہے ۔ بیٹھنے کے لیے

بھی تو کوئی جگہ نہیں۔

(بارش اور تیز ہو جاتی ہے۔ ساتھ ہی تیز ہوا چلنے کی آواز آتی ہے۔)

سلیم۔ بارش کتنے زور سے ہو رہی ہے۔ نہ جانے کتنی دیر رکنا پڑے گا اس اندھیرے میں۔ یار ذرا دروازہ بند کر دو۔ بارش کا شور بھی کم آئے گا۔ اور سرد ہوا سے بھی بچ رہیں گے۔

رومیش۔ اچھا (دروازہ بند کرتا ہے) جیب میں ماچس بھی نہیں ورنہ روشنی کر کے تھوڑی سی جگہ صاف کر لیتے۔

(ایک کونے سے آہستہ سے سانس لینے کی آواز آتی ہے)

رومیش۔ (آہستہ سے) سلیم تم نے کچھ سنا۔

(اور پھر سرگوشی میں گفتگو ہوتی ہے۔)

سلیم۔ ہاں جیسے کوئی اس طرف کونے میں سانس لے رہا ہو۔

رومیش۔ کہیں کوئی چور نہ ہو۔

سلیم۔ چور یہاں کیا لینے آئے گا۔ کوئی گدھا ہو گا۔

رومیش۔ یہاں پر گدھا کہاں۔ انسان کے سانس لینے کی آواز تھی۔

سلیم۔ کوئی جانور ہو گا۔

رومیش۔ نہیں جانور وانور نہیں (پھر کونے سے سانس لینے کی آواز آتی ہے) یہ دیکھا انسان کے سانس لینے کی آواز ہے۔

سلیم۔ ذرا پوچھو تو سہی کون ہے۔

رومیش۔ نہیں بھئی تم ہی پوچھو کون ہے۔

سلیم۔ نہیں نہیں تم پوچھو۔ ڈرو مت۔

رومیش۔ نہ بھائی معاف کرو۔ تم خود ہی پوچھ لو۔ ہمت کرو نا۔

سلیم - تم ڈرتے ہو کیا؟

رومیش - اور تم۔

سلیم - اگر اس وقت تیجا سنگھ ہوتا ضرور ہمت کرتا۔

رومیش - اچھا آؤ دونوں ہی پوچھتے ہیں۔

دونوں ایک ساتھ - کون -

(بالکل خاموشی چھا جاتی ہے۔)

سلیم - (تھوڑی دیر انتظار کے بعد) کچھ بھی تو نہیں۔ ہمارا وہم ہو گا۔

رومیش - وہم کہاں دو دفعہ آواز سنی تھی۔ کچھ گڑ بڑ ہے۔

(پھر سانس لینے آواز آتی ہے۔)

رومیش - لو سنو پھر آواز آئی۔

سلیم - (ذرا زور سے) ارے بھائی کون ہے یہ -

(خاموشی چھا جاتی ہے۔)

رومیش - یہ بولتا کیوں نہیں۔ کون ہے کونے میں -

سلیم -(اور زور سے) جلدی بولو کون ہے ورنہ ٹھیک نہ ہو گا۔

رومیش - ہاں ہاں جلدی بولو کون ہے کیا نام ہے -

سلیم - اور یہاں کیا کر رہے ہو۔

(خاموشی بدستور رہتی ہے۔)

سلیم - ذرا جا کر دیکھو تو کون ہے -

رومیش - نہ بھائی۔ تم ہی جا کر دیکھو۔

سلیم - بھئی چلا تو جاؤں مگر اندھیرا ہے۔

رومیش - تو میرے لیے کون سی بجلی جل رہی ہے۔ اگر کہیں حملہ کر دے تو۔

(زور سے سانس لینے کی آواز آتی ہے)

سلیم۔ اچھا تو میں آگے بڑھتا ہوں (چند قدم آگے بڑھ کر) بولو کون ہے یہاں پر بولتا ہے کہ نہیں۔ ورنہ میں ایک دھر دوں گا۔

(بالکل خاموشی رہتی ہے)

سلیم۔ اچھا تو ٹھہرو پھر (ہوا میں ہاتھ ہلاتا ہے اور فوراً ہی اوہو کہہ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے)

رومیش۔ کیا ہے سلیم۔

سلیم۔ ارے بھئی یہ تو ..... (رک جاتا ہے)

رومیش۔ یہ تو کیا؟

سلیم۔ (آہستہ سے) کوئی عورت معلوم ہوتی ہے۔

رومیش۔ (حیرت سے) عورت!

سلیم۔ ہاں۔

رومیش۔ وہ کیسے۔

سلیم۔ میں نے جب اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ایک ملائم اور لمبی سی چیز میرے ہاتھ میں آ گئی۔

رومیش۔ ملائم اور لمبی سی چیز۔

سلیم۔ ہاں ریشم سی ملائم۔ سمجھے کیا۔ سر کے بال۔

رومیش۔ سر کے بال ارے نہیں گدھے کی دُم ہو گی۔ تمہیں ضرور دھوکا ہوا ہے۔

سلیم۔ نہیں دھوکا نہیں ہوا اور تم تو کہتے تھے یہاں گدھا یا جانور کہاں سے آئے گا۔ اور پھر گدھے کی دُم سر پہ تو نہیں لگی ہوتی

رومیش۔ اچھا یہ بات ہے تو اب میں جاتا ہوں۔

(سانس لینے کی آواز آتی ہے اور ساتھ ہی رومیش کے قدموں کی۔ وہ آگے بڑھتا ہے۔)

رومیش - ارے بھئی جو کوئی بھی ہے بول پڑے کہ کون ہے ورنہ اُس کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

(خاموشی رہتی ہے۔)

رومیش - (ذرا زور سے) جانتے ہو میرے ہاتھ میں کیا ہے۔ ریوالور ہے ریوالور سمجھے۔

(دبی ہنسی کی آواز آتی ہے)

رومیش - اچھا تو لو پھر (آگے بڑھ کر ہاتھ چلاتا ہے اور پھر فوراً ارے کہہ کر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔)

سلیم - کیوں رومیش کیا پتہ چلا۔

رومیش - تم سچ کہتے ہو سلیم - واقعی کوئی عورت ہے۔

سلیم - تم نے کیسے جانا۔

رومیش - میں نے اندھیرے میں ہاتھ گھمایا تو اُس کی کلائی پہ پڑا اور چوڑیاں سی محسوس ہوئیں۔

سلیم - کیوں میں نہ کہتا تھا کہ عورت ہے۔

رومیش - (آہستہ سے) مگر یہاں آئی کیسے!

سلیم - (آہستہ سے) کسی گاؤں کی ہو گی گھر جا رہی ہو گی بارش میں رُک گئی۔ مگر ہے جوان۔

رومیش - جوان - وہ کیسے معلوم ہوا۔

سلیم - ارے بدھو اگر بوڑھی ہوتی تو فوراً بول پڑتی۔ بلانے پر فوراً کہتی بیٹا" بوڑھی عورت کو کس بات کا ڈر۔

رومیش - ہوں ٹھیک کہتے ہو (ذرا آواز سے) دیکھیے معاف کیجیے گا مجھے بالکل پتہ نہیں تھا کہ آپ ہیں ورنہ ایسی حرکت نہ کرتا۔

سلیم - اور ہاں مجھے بھی معاف فرمائیے گا اگر پتہ ہوتا کہ یہ آپ ہیں تو ایسی گستاخی کبھی نہ کرتا۔

رومیش - اور ہاں دیکھیے آپ کو کھڑے کھڑے تکلیف ہوتی ہوگی میں زمین صاف
کر کے کوٹ بچھائے دیتا ہوں - آپ تشریف رکھیے -
سلیم - ہاں تشریف رکھیے - جب تک بارش ہوتی ہے میں بھی کوٹ بچھا دیتا ہوں -
(دونوں اندھیرے میں زمین صاف کر کے کوٹ بچھا دیتے ہیں -)
رومیش - لیجیے میں نے کوٹ بچھا دیا - بیٹھ جائیے -
سلیم - اور میں نے بھی بچھا دیا تشریف رکھیے -
(سانس اور قدموں کی آواز)
رومیش - اچھا تو آپ بیٹھ گئیں - میرا نام رومیش ہے -
سلیم - اور میرا نام سلیم ہے -
رومیش - اور میں بی اے میں پڑھتا ہوں - گارڈن کالج میں -
سلیم - اور میں بھی گارڈن کالج میں بی اے میں پڑھتا ہوں -
رومیش - (چڑ کر) ارے بھئی سلیم یہ کیا تکلیف ہے جو بات میں کہتا ہوں وہی تم
کہتے ہو - یہ کیا ہز ماسٹرز وائس بن رہے ہو -
سلیم - کیوں کیا ہرج ہے جو میرا دل چاہے گا کہوں گا - تم کوئی ٹھیکیدار ہو -
رومیش - ٹھیکیدار - کیا مطلب -
سلیم - مطلب یہ کہ جو میں چاہوں گا کہوں گا - تم کون ہوتے ہو روکنے والے تم سمجھتے
ہو کہ تمہارا ہی ان سے بات کرنے کا حق ہے -
رومیش - اچھا رہنے دو حق وق کو -
(پھر وہی ہنسی کی آواز آتی ہے)
رومیش - اجی آپ ہنستی ہیں - میں سچ کہتا ہوں سلیم تم دوستی کے قابل نہیں ہو
سلیم - تم دوستی کے قابل یقیناً ہو -

رومیش۔ تم کو تو ہمیشہ مجھ سے عند رہی ہے۔

سلیم۔ تم کو بڑی محبت ہے مجھ سے۔

(پھر وہی ہنسی کی آواز آتی ہے)

رومیش۔ اگر ناگوار نہ ہو تو میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں۔

سلیم۔ اور یہ بھی فرمائیے کہ آپ ایسے وقت اِدھر کیسے تشریف لے آئیں؟

(خاموشی رہتی ہے۔)

رومیش۔ فرمائیے فرمائیے کیا ہرج ہے مجھ سے تو بولیے۔

سلیم۔ ڈریے مت کسی بات سے۔ ہم شریف انسان ہیں۔ خدانخواستہ کوئی ایسے ویسے نہیں ہیں۔

رومیش۔ ہاں ہاں ڈریے مت کچھ تو بولیے۔

(خاموشی بدستور رہتی ہے)

سلیم۔ شاید آپ ہم لوگوں سے گھبرا رہی ہیں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ اتنا ضرور بتا دیں کہ آپ رہتی کہاں ہیں تاکہ جب بارش ختم ہو تو میں آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔

رومیش۔ آپ اس کا اعتبار نہ کیجیے میں چھوڑ آؤں گا۔

سلیم۔ (غصہ سے) نہیں نہیں میں چھوڑ آؤں گا۔ اس شخص کا بھروسہ نہیں۔

رومیش۔ تم کون ہوتے ہو چھوڑ کر آنے والے۔ میں خود چھوڑ کر آؤں گا۔

سلیم۔ بکواس مت کرو رومیش۔ میں دیکھ رہا ہوں تم حد سے بڑھ رہے ہو۔

رومیش۔ تم بھی مت بکو سلیم۔ جتنا میں نرم پڑتا ہوں اتنا ہی تم سر چڑھتے جا رہے ہو تم میں ذرا بھی شرافت نہیں۔

سلیم۔ ہاں ہاں شریف تو دنیا میں صرف تم رہ گئے ہو۔ بڑے آئے خاندانی۔

رومیش ۔ دیکھو سلیم میں کہتا ہوں ذرا مُنہ سنبھال کر بات کرو۔ یہاں کبھی کسی کی گرم بات نہیں سُنی ۔

سلیم ۔ جاؤ جاؤ گرم بات نہیں سُنی ۔ یہ رُعب کسی اور کو دینا ۔ یہاں دبنے والے نہیں ہیں ۔ رذیل کہیں کے ۔

رومیش ۔ (غصے سے) کیا کہا کمینے ۔

سلیم ۔ کمینہ تمہارا باپ ۔

رومیش ۔ رذیل تمہارا باپ ۔ تمہارے باپ کا باپ ۔

سلیم ۔ وہ وقت بھول گئے جب دادا جان سول سرجن کے اردلی تھے جوتے سیدھے کرتے کرتے کچھ پا گئے نواب خاندانی بنتے ہیں ۔ اپنی اصلیت نہ بھولو ۔

رومیش ۔ اور تم بھی وہ دن بھول گئے جب تمہاری دادی جان لوگوں کے برتن صاف کرتی تھیں ۔ ذرا اپنی خبر لو ۔

سلیم ۔ ابے جا ۔ بکتا کیا ہے تمہارے جیسے نواب بھی ہمارے ہاں برتن صاف کرتے ہیں ۔

رومیش ۔ اور تمہارے جیسے ہمارے ہاں اب بوٹ صاف کرتے ہیں ۔

سلیم ۔ بوٹ تمہارے باپ کو بھی کبھی دیکھنا نصیب ہوا ہے ۔

رومیش ۔ میں کہتا ہوں زبان سنبھال ۔ اندھیرے میں ہی ہاتھ دھر دوں گا

سلیم ۔ ابے چل ہاتھ دھرے گا ۔ ایک ہاتھ بھی پڑ گیا تو نانی یاد آجائے گی ۔

(ذرا زیادہ ہنسی کی آواز آتی ہے)

سلیم ۔ اجی آپ ہنستی ہیں ۔ خدا کی قسم یہ ہے ہی کمینہ ۔

(اور ہنسی کی آواز آتی ہے)

رومیش۔ سچ عرض کرتا ہوں۔ ایسا رذیل میں نے کبھی دنیا کے پردے پر نہیں دیکھا۔
دوست بنتا ہے۔ کہتا تھا نرگس کے معاملے میں میں دستبردار ہو جاتا۔
صورت تو دیکھو۔

سلیم۔ اور تم کیا بکتے تھے۔ میری خاطر محبت کا گلا گھونٹ دیا۔ منہ تو دیکھیے۔ اچھا
محترمہ۔ اس کمینے کو پھینکیے جہنم میں مجھے اپنے گھر کا پتہ بتائیے۔ میں آپ
کو گھر چھوڑ آؤں گا۔

رومیش۔ تو چھوڑ کر آئے گا۔ لاٹ صاحب کا بچہ ہے نا۔ اجی آپ مجھے بتایئے
میں گھر پہنچا کر آؤں گا۔

سلیم۔ پھر وہی بات۔ آگئے نہ اپنی اوقات پر۔
رومیش۔ اور تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔ بڑے خوبصورت ہو۔ تم چھوڑ کر آؤ گے۔
سلیم۔ ہاں تم سے تو اچھا ہی ہوں۔ بندر کبھی آئینے میں صورت تو دیکھو۔
رومیش۔ اپنے منہ سنبھال لنگور۔ میں کہے دیتا ہوں۔ اچھا نہ ہوگا۔

(پھر ہنسی کی آواز آتی ہے)

سلیم۔ اچھا ابھی فیصلہ ہوتا ہے کہ کون چھوڑ کر آئے گا۔ ان سے پوچھ لیتے ہیں۔ اچھا
اب بارش بھی بند ہو رہی ہے۔ اور باہر روشنی بھی ہوگی۔
رومیش۔ ہاں یہ منظور۔ جن کو یہ کہیں وہی چھوڑ آئے۔
سلیم۔ اچھا محترمہ میں سلیم ہوں اور یہ رومیش ہے۔ آپ جس کا نام لیں گی وہی
آپ کو گھر چھوڑ آئے گا۔

(ہنسی کی آواز آتی ہے)

رومیش۔ ہاں ہاں نام لیجیے۔ ہنسیے مت۔ یہاں پر تو زندگی اور موت کا سوال ہے۔
سلیم۔ لیجیے اب بارش تو بند ہو گئی ہے۔ باہر چل کر بتا دیجیے۔ کچھ روشنی بھی ہوگی

جلدی کیجیے ایسا نہ ہو راستہ میں رات پڑ جائے یا پھر بارش شروع ہو جائے۔

(تھوڑی دیر خاموشی - پھر قدموں کی آواز آتی ہے اور دروازہ کھلتا ہے۔)

رومیش - اچھا آپ باہر چلی گئیں۔

(دونوں کوٹ اُٹھا کر جھاڑتے ہیں اور باہر سے قہقہوں کی آواز آتی ہے)۔

سلیم - ارے یہ قہقہے کون لگا رہا ہے۔

رومیش - چلو باہر چل کر دیکھیں۔

(دونوں باہر جاتے ہیں)

سلیم - ارے یہ کون - تیجا سنگھ،

رومیش - ہت تیرے کی تیجا سنگھ۔

سلیم - ارے یہ اندر تم ہی تھے۔

رومیش - تم ہی ہمارے کوٹوں پر مزے سے بیٹھے تھے۔

(تیجا سنگھ ہنستا ہے)

کالے خاں کا تھیٹر

بیس پچیس سال قبل

تھیٹر کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے ۔ بیڑی اور سگریٹ کے دھوئیں اُڑ رہے ہیں سیٹیاں بج رہی ہیں اور شور و غل ہو رہا ہے کھیل ساڑھے نو بجے شروع ہونا تھا مگر اب دس بج گئے ہیں اور کھیل شروع نہیں ہوا ۔ کس بات کا انتظار ہے؟ ابھی چند کرسیاں کسی کلاس میں خالی پڑی ہیں جیسے وہ بھی خالی نہ رہیں کھیل شروع ہوتا ہے

بڑے زور کا دھماکا ہوتا ہے اور پردہ اُٹھتا ہے ۔ دربارِ خاص لگا ہے شہنشاہ سلامت ٹینس کی سفید پتلون اور باجے والوں کا سُرخ کوٹ پہنے لکڑی کے ایک تخت پر جلوہ افروز ہیں ۔ پاؤں میں چکوال کا تِلّہ جوتا ہے ۔ شہنشاہ کا تاج چمک رہا ہے، یہ تاج سگریٹ، کی ڈبیہ کی پنی سے بنایا گیا ہے ۔ تخت ایسا ہے جیسے کسی مسجد کا منبر ہو ۔ جس پر پتنگوں کے رنگین کاغذ چسپاں کر دیے گئے ہیں ۔ شہنشاہ کے ہاتھ میں میان بند تلوار رکھی ہوئی نظر آ رہی ہے اصل میں تلوار کا دستہ میان میں ٹھونک دیا گیا ہے ۔ تلوار کا پھل غائب ہے شہنشاہ سلامت کے پیچھے ایک خدمت گار ڈنڈے کے ساتھ گھوڑے کی دُم باندھے مکھیاں ہلا رہا ہے ۔ سامنے امیر وزیر مصاحب وغیرہ ادب کے ساتھ ٹین کی کرسیوں پر باجے والوں جیسا لباس پہنے رونق افروز ہیں ۔ تخت کے

پیچھے پردے پر نقش و نگار اور سینری بینٹ کی ہے۔ ایک سرسبز آم کے درخت کے نیچے جس میں امرود لگے ہیں۔ ڈاک خانے کا ایک سُرخ لیٹر بکس کھڑا ہے۔ یہ لیٹر بکس دیوان خاص میں شاید اس لیے ہے کہ شہنشاہ کو خط پوسٹ کرنے کے لیے باہر نہ جانا پڑے۔ کہیں تار کے کھمبے نظر آ رہے ہیں۔ اور ایک ہوائی جہاز بھی آسمان پہ اُڑتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ یہ شاید شہنشاہ کا ذاتی جہاز ہے جو دیوان خاص میں آگھسا ہے اس وقت عورت نما ڈانسر اچھل کود رہے ہیں۔ انہوں نے ریشمی رنگ دار شلواریں اور قمیصیں اپنی اپنی بیویوں کی یا کسی سے مانگ کر پہن رکھی ہیں اور کمریں دوپٹوں سے کسی ہوئی ہیں۔ فارسی کی کوئی غزل پنجابی تلفظ میں سنائی جا رہی ہے۔ ناچ گانے والے آداب بجا لا کر رخصت ہوتے ہیں۔

شہنشاہ۔ مربا، مربا، اے سلطنت کے نورتنوں مربا۔

دربان دربار میں حاضر ہو کر تین بار جھکتا ہے اور ساتھ ہی ہاتھی کی سونڈ کی طرح ہاتھ ہلاتا ہے۔ اور ہاتھ باندھ کر شہنشاہ کی طرف مُنہ کر کے عرض کرتا ہے:

دربان۔ اے شہنشاہِ تاجدار۔ حکمرانِ دمدار، حضور کا اقبال بلند رہے۔ ازل ابدانی کی قدم بوسی کے لیے شہنشاہ گیجر خاں کا ایلچی حاضر خدمت ہوا ہے۔ حکم سرکار عالی وقار ہو تو حاضر کیا جائے۔

شہنشاہ۔ اے دربانِ خاص۔ تیرا ستیاناس۔ تو رہے عمر بھر اداس۔ تیری بجھے نہ کبھی پیاس تو نے یہ کیا کہا، جلد مجھ کو بتا۔ یہ شہنشاہ گیجر خاں کا ایلچی کیوں حاضر خدمت ہونا چاہتا ہے۔

دربان۔ جہاں پناہ۔ جان کی امان پاؤں تو پھر عرض کروں۔

شہنشاہ۔ ہاں بدولت کو جان کی امان دینے میں اعتراض نہیں۔ پھر عرض کرنے کی اجازت ہے۔

دربان ۔ (جھک کر) دستِ پناہ ۔ بندۂ ناچیز کے الفاظ حضورِ انور کے گوشِ مبارک تک رسائی نہ حاصل کر سکے ۔ یہ غلام ۔ غلامِ بے دام عرض کرتا ہے کہ شہنشاہ گجر خاں کا ایلچی یعنی ہائی کمشنر باریابی کی درخواست کرتا ہے ۔ اور شاہی اصطبل کے پاس کھڑا انتظار کر رہا ہے ۔

شہنشاہ ۔ اچھا ۔ شہنشاہ گجر خاں کا ایلچی ہے ۔ اسے فوراً سے پیشتر سے پہلے حاضرِ خدمت کیا جائے ۔

(دربان جھک کر آداب بجالاتا ہے اور اُلٹے قدم باہر جانے لگتا ہے ۔ سٹیج اونچی نیچی ہے ۔ اُلٹے چلتے ہوئے پاؤں پھٹی ہوئی دری کے سوراخ میں الجھ جاتا ہے ۔ دربان دھم سے گر پڑتا ہے آہستہ سے دری کو خوبصورت سی گالی دیتا ہے اور پھر پھرتی سے اُٹھ کر رفو چکر ہو جاتا ہے)

تھوڑی دیر بعد ایک ایلچی تماالشان باجے والوں کا سوٹ پہنے پستول کی طرف پیٹی لگائے دربار میں حاضر ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی تین گدھے سازو سامان سے لدے ہوئے سٹیج پر آتے ہیں ۔

دربان ۔ (جھک کر) اے شہنشاہِ زنگار تنگ ۔ ہفت اورنگ ۔ شہنشاہ گجر خاں کا ایلچی حاضرِ خدمت ہے ۔

ایلچی تین بار جھک کر اور ہاتھی کی سونڈ کی طرح ہاتھ اوپر نیچے ہلا کر سیدھا کھڑا ہو جاتا ہے اور عرض کرتا ہے ۔

ایلچی ۔ شہنشاہِ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی خدمتِ اقدس میں یہ حقیر غلام آداب بجا لا کر عرض کرتا ہے کہ شہنشاہ گجر خاں نے شہنشاہِ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی خدمت میں پورے سات سلام ارسال کیے ہیں ۔ لے دست پناہ گن کر قبول فرمایئے ۔

شہنشاہ ۔ سات سلام قبول کیے جاتے ہیں اور کیا کہا ہاں بدولت کے دلی جگری دوست شہنشاہ گجر خاں نے ۔

ایلچی ۔ شہنشاہ گجر خاں نے جہاں پناہ کی خدمت میں ایک خط بھیجا ہے (ایلچی دو لکڑی کے ڈنڈوں پر لپٹا ہوا ایک لٹھے کا ٹکڑا جھک کر شہنشاہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے)

شہنشاہ (وزیر تعلیم کی طرف اشارہ کر کے) اے میرے وزیر تعلیم ہمیں امید ہے کہ تمہاری تعلیم مکمل ہو چکی ہوگی اور تم یہ خط پڑھ سکو گے ۔

وزیرِ تعلیم ۔ (ایلچی سے خط لے کر اور جھک کر) ایسے ملکوں کے مالک سر سبز رہے حضور کے کھیتوں میں میتھی پالک ۔ بندہ یہ خط پڑھ کر جہاں پناہ کو ابھی مطلب بتاتا ہے ۔ دست پناہ کو خط سننے کی آس ہے ۔ بندہ یہ خط پڑھ سکے گا ۔ کیونکہ میٹرک فیل لیکن مڈل پاس ہے ۔

شہنشاہ ۔ اے وزیرِ عقلمند ۔ گرگفتگو اپنی بند ۔ خط کو خود پڑھ اور ہاں بدولت کو مطلب بتا ۔

شہنشاہ (ایلچی سے) شہنشاہ گجر خاں کے ایلچی کہو ہمارے دوست کا کیا حال ہے کیسی گذرتی اس کی صبح و شام ہے اور کیا اُسے اب بواسیر سے آرام ہے ۔

ایلچی ۔ حضور عالم پناہ ۔ شہنشاہ گجر خاں کو سب آرام ہے یہ سب دیسی سول سرجن نتھو کا کام ہے اس نتے کی کرامات ہے اور شہنشاہ کو بواسیر سے دی نجات ہے ۔

شہنشاہ ۔ خوب بہت خوب ویری گڈ ۔

ایلچی ۔ (گدھوں کی طرف اشارہ کر کے اور جھک کر) جہاں پناہ شہنشاہ گجر خاں نے

حضور دوست پناہ کی خدمت میں چند تحفے ارسال کیے ہیں۔

شہنشاہ۔ ہمارے دوست نے کی ہماری عزت افزائی ہے اور کہیں سے قرض لے کر یہ تکلیف فرمائی ہے گو یہ اس کی نادانی ہے۔ لیکن پھر بھی مہربانی ہے۔ وزیر تحفہ جات حاضر ہو کر تحفوں کی تفصیل بیان کرے۔

وزیر تحفہ جات ایک موٹا تازہ پلا ہوا شخص لوہے کی کرسی سے جھٹکے کے ساتھ اُٹھتا ہے۔ کرسی پیچھے گر جاتی ہے وہ پلٹ کر کرسی کو کھڑا کرتا ہے اور پھر آداب بجا لاتا ہے۔ ایلچی کے ساتھ گدھوں کے پاس جاتا ہے اور ان پر لدی ہوئی چیزوں کو دیکھتا ہے اور پھر عرض کرتا ہے۔

وزیر تحفہ جات۔ حضور عالم پناہ۔ بندہ تحفوں کی تفصیل عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔

شہنشاہ۔ اجازت ہے جلد عرض کرو۔

وزیر تحفہ جات۔ عالم پناہ ایک گدھے پر تحفہ مونگ پھلی ہے۔

شہنشاہ۔ خوب بہت خوب۔ مونگ پھلی سونے کی ڈلی ہے۔

وزیر تحفہ جات۔ اے مالک ملک عظیم الشان۔ یہ گدھے دست پناہ پر قربان۔ ایک مکمل گدھا مولیاں اور گاجریں اُٹھائے ہوئے ادب سے کھڑا ہے۔

شہنشاہ۔ خوب بہت خوب ماں بدولت دال کھاتے کھاتے اُکتا گئے ہیں۔ وزیر خوراک کو حکم دیا جائے کہ آج مولیاں اور گاجریں بشکل سالن دستر خوان پر حاضر کرے۔

وزیر خوراک۔ (آداب بجا لا کر) جہاں پناہ کا حکم سر ماتھے اور آنکھوں پہ۔ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو مولیوں اور گاجروں میں ڈیڑھ پاؤ مونگ پھلی سونے کی ڈلی ڈالی دی جائے۔

شہنشاہ ۔ وینڈر قل اجازت ہے ۔ وزیر تحفہ جات آخری شاہی گدھے پر کیا تحفے ہیں ۔
وزیر تحفہ جات ۔ اے شہنشاہ ، مدار آخری تحفہ بہت قیمتی اور نایاب ہے ۔
شہنشاہ ۔ جلد کہو کیا ہے ۔ ماں بدولت مائل با ضطراب ہیں اور سننے کے لیے بے تاب ہیں ۔ اور چاہتے جاننا شتاب شتاب ہیں ۔
وزیر تحفہ جات ، ۔ جہاں پناہ گدھا نمبر ۳ پر ہیں تحفے البیلے یعنی خالص مٹی کے ڈھیلے ۔
شہنشاہ ۔ خوب بہت خوب تحفہ ہے مٹی کے خالص ڈھیلے ۔ ماں بدولت کا فرمان ہے کہ یہ تحفہ نایاب ہماری رعایا کے لیے وقف کر دیا جائے ۔ ماں بدولت کے تحفوں میں رعایا کا حصہ بھی شامل ہے ۔ وزیر برکات و عمارات کسی ایس ۔ ڈی ۔ او ۔ کو حکم دے کہ ' ماں بدولت ' کی خواہش ہے کہ ان مٹی کے ڈھیلوں کا جگہ جگہ شہر کی نالیوں پر ڈھیر لگا دیا جائے تاکہ ہماری پیاری رعایا سہولت اور آزادی کے ساتھ استعمال کر سکے ماں بدولت کو رعایا کا خیال بے چین رکھتا ہے اور اکثر ماں بدولت کی آنکھ اسی خیال میں صبح ساڑھے دس بجے کھل جاتی ہے اور ہم شہنشاہ گبھر خاں کے نہایت مشکور ہیں کہ جہاں انہوں نے ہمیں تحفے بھیجے وہاں ہماری رعایا کا بھی خیال رکھا ۔ ایلچی ہماری طرف سے اور خاص کر ہماری رعایا کی طرف سے شہنشاہ گبھر خاں کا شکریہ ادا کرتا ہمیں ہماری رعایا بہت عزیز ہے ۔
چند آوازیں ۔ شہنشاہ ٹوبہ ٹیک سنگھ زندہ باد ۔ ہپ ہپ ہرّے ۔
ایک مصاحب ۔ اس میں کیا شک ہے کہ جہاں پناہ رعایا کے لیے بہت بے قرار رہتے ہیں ۔ جہاں پناہ کو چوبیس گھنٹوں میں سے صرف پونے چوبیس گھنٹے آرام کے لیے میسر آتے ہیں ۔ پندرہ منٹ کی طویل مدت رعایا کے آرام کے متعلق سوچنے میں ضائع ہو جاتی ہے ۔

شہنشاہ۔ شاباش اے مصاحب باوقار۔ اے ماں بدولت کے جاں نثار۔ ارے کوئی ہے۔

ایک خدمت گار حاضر ہو کر جہاں پناہ۔

شہنشاہ۔ ماں بدولت کا حکم ہے آدھ سیر مولیاں اور ایک پاؤ گاجریں پتوں سمیت ، ایک چھٹانک مونگ پھلی سونے کی ڈلی اور ایک سیر مٹی کے ڈھیلے ہمارے اس جاں نثار مصاحب کے گھر اسی وقت بھیج دیئے جائیں۔

خدمت گار اور مصاحب جھک کر آداب بجا لاتے ہیں۔

شہنشاہ۔ دارغہ اصطبل کو حکم دیا جائے ان شاہی گدھوں کو بطور شاہی مہمان شاہی اصطبل میں ٹھہرایا جائے اور ان کی شاہی گھاس سے خاطر تواضع کی جائے۔

ایک خادم آگے بڑھ کر آداب بجا لا کر گدھوں کو باہر لے جانے لگتا ہے۔ دو گدھے تو چل پڑتے ہیں۔ مٹی کے ڈھیلوں والا گدھا اکڑ کر کھڑا رہتا ہے۔ خادم گالی دے کر ڈنڈا رسید کرتا ہے۔ گدھا ڈنڈا پڑنے کے بعد ڈھینچوں ڈھینچوں کرتا ہوا اسٹیج سے بھاگ جاتا ہے۔ چند مٹی کے ڈھیلے گر جاتے ہیں جو وزیر خوراک اٹھا لیتا ہے۔

شہنشاہ۔ وزیر تعلیم اگر شہنشاہ گبھر خاں کا خط پڑھ چکا ہو۔ تو اس کا مطلب بیان کرے۔

جو خادم شہنشاہ کے پیچھے ڈنڈے کے ساتھ گھوڑے کی دُم باندھ کر مور چھل ہلا رہا ہے وہ اونگھنے لگتا ہے۔ اونگھتے ہوئے وہ شہنشاہ کی طرف گرنے لگتا ہے۔ شہنشاہ پیچھے مڑ کر دیکھنے لگتا ہے اور آہستہ سے خادم کو کہتا ہے۔ "امے نورے دے پُتّر بندے دا پُتّر بن"۔

خادم سیدھا کھڑا ہو کر شرم مٹانے کے لیے دوسرے خادم سے مخاطب ہو کر زور سے کہتا ہے "حضور جہاں پناہ کے لیے برف کا پانی حاضر کیا جائے"۔ خادم پانی لینے کے لیے دوڑتا ہے۔

وزیر تعلیم - جہاں پناہ اجازت ہو تو عرض کردوں۔ خط میں شہنشاہ گبجر خاں نے درخواست کی ہے کہ وہ ہمارے ولی عہدِ سلطنت کے ساتھ اپنی دختر نیک اختر شہزادی صاحبہ کی شادی کے خواہشمند ہیں۔ تحریر فرماتے ہیں کہ شہنشاہ گبجر خاں بہت مسرور، مشکور اور مشہور ہوں گے اگر ولی عہد ٹوڈیہ ٹیک سنگھ کو اُن کی فرزندی میں دے دیا جائے۔ انہیں امید ہے کہ ان کی اس خواہش کا احترام کیا جائے گا۔

اتنے میں ایک خادم تانبے کے ملیسے سے گلاس میں شہنشاہ کے لیے پانی لاتا ہے اور ادب کے ساتھ جھک کر پیش کرتا ہے۔ شہنشاہ گلاس مُنہ کو لگاکر ایسے ظاہر کرتا ہے کہ پانی پی چکا ہے۔ گلاس خادم کو واپس کرتا ہے اور اُسے آہستہ سے کہتا ہے "اوئے پانی تے گلاس وِچ ہے ہی نہیں"

خادم - (آہستہ سے) یار تیرے پیو دا نلکہ لگا ہویا اے۔ پانی کتھوں آوے"

شہنشاہ - شہنشاہ گبجر خاں کا خیال اچھا ہے ارادہ نیک ہے مگر ہم .....

یہاں پر شہنشاہ اپنی ڈائیلاگ بھول جاتا ہے اور ادھر ادھر دیکھتا ہے پیچھے مورچھل والا خادم ڈنڈے کا سرا شہنشاہ کی کمر میں چھوکر آہستہ سے کہتا ہے "او اگے بک جلدی نال تیرا بیڑا غرق سرا ج دیتا"

شہنشاہ - (آہستہ سے) یار ڈائیلاگ بھل گیا ہاں کی گواں"

خادم - (آہستہ سے) "بول کجھ تے بول"

شہنشاہ - (گھبراہٹ میں) ایلچی! مگر ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تمھارا نام کیا ہے۔

ایلچی یہ غیر متوقع سوال سُن کر گھبرا گیا کہ شہنشاہ کو پوچھنا تو کچھ اور تھا یہ کیا پوچھ لیا۔ اور وہ اپنا اصلی نام بتا دیتا ہے۔

ایلچی ۔ غلام پرور، دست پناہ اس بندہ ناچیز کا نام ماسٹر مولا بخش پٹیالوی ہے۔
شہنشاہ ۔ (اسی گھبراہٹ میں) ایلچی تم کہاں کام کرتے ہو۔
ایلچی ۔ جہاں پناہ بندہ کالے خاں کے تھیٹر میں کام کرتا ہے۔
شہنشاہ ۔ (گھبراہٹ میں) کیا تنخواہ ملتی ہے تم کو۔
ایلچی ۔ عالم پناہ! تنخواہ کا کیا ہے۔ کبھی ملتی ہے اور کبھی ملتی ہی نہیں۔ جو جہاں پناہ کا حال ہے سو اپنا ہے۔

اس پر ہال میں قیامت کا شور ہوتا ہے اور سیٹیاں بجتی ہیں۔ شہنشاہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ خادم پھر ڈنڈا کمر میں چبھو کر آہستہ سے کہتا ہے۔
"سوچ کے بول اوئے اتنے وا بکنا ایں"

اتنے میں شہنشاہ کو ڈائیلاگ یاد آجاتی ہے۔ ہال میں شور کم ہوتا ہے تو شہنشاہ کہتا ہے۔

شہنشاہ ۔ ہاں اے ایلچی مگر ہم یہ رشتہ منظور کرنے اور اپنے ولی عہد کو شہنشاہ گجر خاں کی غلامی میں دینے سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ شہنشاہ گجر خاں اپنی دختر نیک اختر کو کس قدر جہیز دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔
ایلچی ۔ جہاں پناہ اپنی طاقت۔ قوت، اخوت، محنت اور مشقت سے زیادہ اور بہت زیادہ۔
شہنشاہ ۔ مثلاً۔
ایلچی ۔ شہنشاہ عالم۔ اس وقت شہنشاہ گجر خاں کی ملکیت ڈیڑھ سو جوڑی اصلی گدھوں کی ہے جن میں سے تین گدھوں کا ٹریلر حضور بلند اقبال نے ملاحظہ فرمالیا۔

شہنشاہ - اور -

ایلچی - اور جہاں پناہ گجر خاں کی تمام زمین جس پر رعایا ہل چلا کر شاہی خزانہ بھرتی ہے اور خود بھوکی مرتی ہے اور ایک باغ ہے انگور کا جو ہوتا ہے کھٹا اور اس کے علاوہ شہنشاہ کا ذاتی ہے اینٹوں کا بھٹہ۔

شہنشاہ - اے ایلچی! خوش بیاں - قائم رہے تیرا نشاں - یہ اینٹوں کا بھٹہ بیٹھ تو نہیں گیا۔

ایلچی - نہیں عالم پناہ! اینٹوں کا بھٹہ تو نہیں بیٹھا - مگر شہنشاہ گجر خاں کا اپنا بھٹہ بیٹھ رہا ہے -

شہنشاہ - ماں بدولت کو شہنشاہ گوجر خاں کے بھٹہ کے بیٹھنے کا کوئی فکر نہیں اور ہمیں اس کا مطلوب ذکر نہیں - اگر اینٹوں کا بھٹہ بھی جہیز میں دیا جائے تو اچھی بات ہے - ایلچی! کچھ اور عرض کرو۔

ایلچی - ایک جوڑی گوجر گاؤں کے بیلوں کی بھی ہے - جہاں پناہ - بیل بہت خود دار یعنی خاندانی اور طبیعت کے تیز ہیں - آپس میں لڑتے رہتے ہیں - شہنشاہ گوجر خاں کا حکم بھی کم مانتے ہیں -

شہنشاہ - کوئی بات نہیں ہم بیلوں کو منا لیں گے -

ایلچی - زل سبانی - اس کے علاوہ تھوڑا سا سونا - بہت سا لوہا - کپڑے سوتی زیادہ ریشمی کم اور ایک کھیت مونگ پھلی کا - عالم پناہ شہنشاہ گجر خاں جہیز میں شاہزادی کے علاوہ اور بہت کچھ دیں گے -

شہنشاہ - ہمیں رشتہ منظور کر لینا چاہیے - قاضی القضاۃ وزیر رشتہ جات کیا رائے رکھتا ہے -

وزیر رشتہ جات - اے جہانگیر وقت - جہاں پناہ کو رشتہ آنکھیں بند کر کے

منظور کر لینا چاہیے۔

شہنشاہ۔ ہماری مجلس وزراء کی کیا رائے ہے۔

چند آوازیں۔ جہاں پناہ یہ رشتہ منظور کر لینا چاہیے۔ اس سے بہتر رشتہ ملنا محال ہے۔

شہنشاہ۔ ٹھیک ہے۔

سپہ سالار۔ (ادب سے) جہاں پناہ بندہ جان کی امان پائے تو عرض کرے

شہنشاہ۔ (جلدی سے) امان کی جان دی جاتی ہے عرض کرو۔

سپہ سالار۔ اے عالم پناہ بندہ ناچیز کی رائے میں جہاں پناہ ملکۂ عالم سے بھی صلاح فرما لیں اور شہزادۂ نامور سے بھی پوچھ لیں۔

شہنشاہ۔ بہت خوب اے سپہ سالار تم بہت عقلمند ہو بلکہ خالص گلقند ہو۔ تم کو تو قلم دوات وزارت ملنا چاہیے تھا۔ یہ تم نے ٹھیک کہا۔ ملکۂ عالم اور شہزادہ سے ضرور صلاح کرنی چاہیے۔ بیس ڈھیلے سپہ سالار کو انعام میں دیے جائیں۔ اور ایلچی کو شاہی مہمان خانہ میں ٹھہرایا جائے۔ آج ہم بدولت ملکۂ عالم سے صلاح کر کے خط کا جواب کل دیں گے۔

وزیر اعظم۔ (اٹھ کر اور آداب بجا لا کر) جہاں پناہ بندہ بے دام کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔

شہنشاہ۔ ہاں ہاں کہو۔ اجازت ہے۔ ہم خود حیران تھے اور پریشان تھے کہ ہمارے وزیر اعظم ابھی تک کیوں مدہوش ہیں اور خاموش ہیں۔

وزیر اعظم۔ جہاں پناہ ذرا غور فرمائیں یہ رشتہ کیسے ہو سکتا ہے۔

شہنشاہ۔ کیا مطلب؟

وزیر اعظم۔ عالم پناہ حضور ملکۂ عالم سے صلاح کس طرح کر سکتے ہیں! اور شہزادۂ نامور

سے کس طرح پوچھ سکتے ہیں۔

شہنشاہ۔ ہیں! کیا مطلب ہم صلاح گر کیوں نہیں سکتے۔ بیان کیا جائے۔

وزیر اعظم۔ جہاں پناہ حضور کا غلام یہ نہ جان سکا کہ ملکۂ عالم اور شہزادۂ نامور ہیں کہاں!

شہنشاہ۔ ہیں ہیں۔ کیا مطلب صاف بیان کرو۔ وزیر اعظم ایسی گفتگو سے تو تم خاموش ہی اچھے تھے۔ مدہوش ہی اچھے تھے اور بے ہوش ہی اچھے تھے۔

وزیر اعظم۔ اے غلاموں کے آقا۔ جان بخشی ہو تو بندہ عرض کرے۔

شہنشاہ۔ جان بخشی بعد میں ہوتی رہے گی پہلے عرض کرو۔

وزیر اعظم۔ اے حکم کے بادشاہ یہ حکم کا غلام عرض کرتا ہے کہ جب تک جہاں پناہ خود شادی خانہ آبادی نہ کریں ملکۂ عالم کہاں سے آ سکتی ہیں اور جب تک ملکۂ عالم نہ آئیں گی شہزادۂ عالم کہاں سے آئیں گے۔

شہنشاہ۔ (سوچ کر) زندہ باد وزیر اعظم ٹوبہ ٹیک سنگھو زندہ باد۔ خوب یاد دلایا ہماری تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی تو پھر شہزادے کی شادی کا کیا سوال وزیر اعظم ہم تم سے بہت خوش ہیں۔ حقیقت میں وزیر اسی لیے تو مقرر کیے جاتے ہیں کہ بھولی ہوئی باتیں یاد دلائیں۔ ورنہ کیا ان کا اچار ڈالنا ہوتا ہے۔ وزیر اعظم تم بہت ہی قابل ہو۔ آدھی بوری مٹی کے ڈھیلوں کی وزیر اعظم کے گھر بھیجدی جائے۔

وزیر اعظم۔ جہاں پناہ کی ذرہ نوازی اور نوازشوں کا تھینک یو۔

شہنشاہ۔ سپہ سالار نے ہمیں غلط رائے دی تھی۔ اسے سپہ سالار کس عقلمند نے بنایا۔ اس کو تو ہماری فوج میں رنگروٹ ہونا چاہیے تھا۔ اس کے ڈھیلوں کا انعام منسوخ کیا جاتا ہے۔ اے شہنشاہ گوجر خاں کے ایلچی!

ہمیں نہایت افسوس ہے کہ ہم یہ رشتہ نامنظور کرنے پر مجبور ہیں۔ شہنشاہ گوجر خاں کی خدمت میں ماں بدولت کی طرف سے کہہ دیا جائے کہ شہنشاہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی نہ ملکہ ہے نہ شہزادہ احمد ہاں اسے

ایلچی۔ ایک بات یاد آگئی۔ شہنشاہ گوجر خاں سے کہا جائے کہ اگر وہ بھی جہیز دینے کے لیے تیار ہوں تو ماں بدولت بہ نفسِ نفیس بلا شرکت غیرے خود شہزادی سے شادی کرنے کے لیے تیار ہیں۔

ایلچی۔ جہاں پناہ کا اکبال بلند ہو۔ اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے یہ ہماری تحصیل یعنی ملک کی خوش قسمتی ہو گی۔ جہاں پناہ مطلب تو دونوں تحصیلوں یعنی ملکوں میں دوستی پیدا کرنے کا ہے اور تعلقات کو استوار کرنے کا ہے۔

شہنشاہ۔ ہاں اے ایلچی ماں بدولت کو بتایا جائے کہ شہزادی بہت خوبصورت ہے۔

ایلچی۔ ظاہر جہاں پناہ۔ شہزادی خوبصورت ضرور ہو گی۔

شہنشاہ۔ کیا تم نے شہزادی کو نہیں دیکھا!

ایلچی۔ نہیں عالم پناہ۔

شہنشاہ تم کیسے ایلچی ہو۔ اچھا فوراً بیان کیا جائے شہزادی کی عمر کیا ہے۔

ایلچی۔ (گھبرا کر) شہزادی کی عمر جہاں پناہ۔

شہنشاہ۔ ہاں شہزادی کی عمر بتائی جائے۔

ایلچی۔ جہاں پناہ اے شہنشاہ ٹوبہ ٹیک سنگھ ابھی تو شہزادی کی کچھ عمر ہی نہیں۔

شہنشاہ۔ ہیں یہ کیا کہا۔ کچھ عمر ہی نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے تفصیل سے بیان کرو۔

ایلچی۔ عالم پناہ یہ ایسے ہو سکتا ہے، غلام عرض کرتا ہے عالم پناہ شاہی طبیب نے

بتایا ہے کہ آئندہ ماہ یقیناً شہزادی عالم وجود میں آئے گی۔ کیونکہ ملکۂ عالم آج کل بیمار ہیں۔ اور بستر سوار ہیں اور جہاں پناہ شاہی جوتشیوں نے میٹرک کے الجبرے کی کتاب دیکھ کر بتایا ہے کہ شہزادی ہی پیدا ہوگی۔ عالم پناہ شہنشاہ گجر خاں بہت دوراندیش ہیں۔ اس لیے احتیاطاً پہلے ہی رشتہ کا بندوبست کیا جارہا ہے۔

شہنشاہ۔ (غصہ میں) شہزادی ابھی پیدا نہیں ہوئی اور رشتہ کا بندوبست ابھی سے کیا جارہا ہے۔ یہ کیا حماقت ہے۔ ماں بدولت سمجھتے ہیں کہ شہنشاہ گجر خاں نے ہماری سخت توہین کی ہے۔

شہنشاہ اُٹھ کر غصے میں تلوار میان سے باہر کھینچتا ہے۔ تلوار کا دستہ ایک ہاتھ میں آجاتا ہے اور دوسرے ہاتھ میں میان رہ جاتی ہے شہنشاہ دونوں ہاتھ اوپر گھما کر کہتا ہے۔

شہنشاہ۔ سپہ سالارِ اعظم۔ شہنشاہ گجر خاں کے گدھے بحق ماں بدولت ضبط کر لیے جائیں۔ اور اس ایلچی کو دھکے دے کر گجر خاں تک پہنچا دیا جائے۔

(دربار برخاست ہوتا ہے)
